علی شناسی
مصنف:عامر حسینی

عنوان کتاب

علی شناسی

مصنف:عامر حسینی

مقدمہ کتاب

ناتمام

امام علی اور مکتب علی

مکتب علی کا ثقافتی اثر و نفوذ

علی اور تصور توحید

علی ،قران اور سیرت اور عمرانیات

علی کے ساتھ کچھ دیر

مسند خالی ہوجائے گی تو ....

ڈاکٹر علی شریعتی اور علی شناسی

مکتوبات علی کے آئینے میں علی شناسی

شب ضربت

غدیر خم سے کربلا تک

شہر بانو اور نہج البلاغہ

کنکریاں

عذاب

ایک تھا مستجاب حیدر

مقدمہ کتاب

مسلمان گھرانوں میں علم اور دانش کی جب بھی بات ہوتی ہے تو کہیں نہیں کہیں یہ قول رسول علیہ السلام

ضرور آتا ہے کہ "انا مدینۃالعلم و علیؑ بابھا"مطلب یہ
"ہے کہ "میں شہر علم اور علی اس کا دروازہ ہیں

میں نے دوسرے بچوں کی طرح اپنے گھر میں،گھر
سے باہر یہ بات سننا شروع کی تھی اور آج جب میری
جوانی کا سورج غروب ہونے کو ہے اور ادھیڑ عمری
کی شام شروع ہونے کو ہے تو بھی یہ تذکرہ اسی طرح
سے میرے کانوں میں پڑرہا ہے-میں اپنے بچپن میں
ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کا تصور باندھتا تھا اور
اس کے ایک بہت بڑے چوبی دروازے کو اپنے ذہن
کے پردے پر اتارلیا کرتا تھا-اس تصویر کو قول رسول
کی شہودی تصویر قراردیتا اور اس بڑے قلعہ اور
چوبی دروازے میں قائم نسبت کو میں شہر علم اور
-باب شہر العلم کے درمیان نسبت سے تعبیر کرتا تھا

ہمارے شہر کی جو مرکزی امام بارگاہ تھی اس کے
مرکزی دروازے کے عین اوپر بنی چوکھٹ پر یہی
قول رسول لکھا تھا-امام بارگاہ کا مرگوی دروازہ بھی
بہت بلند اور لمبا چوڑا تھا-جب کبھی اس امام بارگاہ
میں جانا ہوتا تو میرے تخیل میں بنی تمثال پھر سے

زندہ ہوجایا کرتی تھی-اور مجھے لگتا تھا کہ میں باب
-العلم سے گزرتا ہوا شہر علم میں داخل ہورہا ہوں

میری دادی رات کو سوتے ہوئے مجھے ایک کہانی
بہت سناتی تھیں جس میں علی ایک کردار کے طور پر
ضرور شامل ہوتے تھے-علی یہاں کسی نہ کسی
مصیبیت زدہ کے کام آنے کا فریضہ ادا کرتے دکھائی
دیتے تھے-ان کاعلم ان کی مدد کو آتا تھا اور روح
رسول ان کی مدد کیا کرتی تھی-میں ان کہانیوں میں
-علی کے کرداروں کو خود ازسرنو تشکیل دیتا تھا

ایک علی وہ تھے جن سے میں اپنے دادا،دادی،نانا،نانی
اور بڑے ماموں کی وساطت سے آشنا ہورہا تھا-یہ علی
علم و دانش،عقل و فہم کے بلند مقام پر فائز تو تھے
مگر مافوق الفطرت نہ تھے-دوسرا تصور علی کے
بارے میں مولویوں،ذاکروں کا بیان کردہ تھا جس میں
علی کی شخصیت کا اساسی جوہر علم و دانش نہیں تھا
بلکہ ان کی شخصیت کو بہت زیادہ اسرار کے پردوں
میں پوشیدہ رکھنے پر مبنی رجحان غالب تھا-یہاں سے
-تعقل اور فکر غائب تھے

ہندوستان ،پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلم گھرانوں میں جہاں سلفی وہابیت اور دیوبندیت کا غلبہ نہ ہے یہ رواج عام ہے کہ ان کے ہاں بزرگان دین کے ایام ہائے ولادت و وفات کے موقع پر تقریبات کا انعقاد عام ہے- اور شیعہ کے ہاں تو اہل بیت اطہار کی زندگی کے اکثر واقعات کے ایام پر مجالس کا اہتمام ہوتا ہے-یہ روش ایک زرخیز کلچر کو جنم دیتی ہے-اور اس زرخیز کلچر کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ غیر محسوس طریقے سے آپ تاریخ اسلام کے اہم واقعات و شخصیات کے ساتھ واقفیت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں-

علی کے بارے میں خصوصی طور پر اور اہل بیت اطہار کے بارے میں عمومی طور پر میرا اولین تاریخی فہم اسی کلچر کی دین تھا-اور اس کلچر کے جلو میں میرے دادا اور دادی کی جانب سے ایک زیلی ثقافتی رو اور لہرمیرے فہم کا حصّہ بنے-اور وہ علی کی بطور صاحب علم اور فقر اختیاری کے حامل فرد کے طور پر پہچان کرنے کی رو اور لہر تھی-اس لہر

اور رو نے مجھے اس کلچر کی رو میں بہہ جانے سے بچایا جو میرے اردگرد شیعت کے نام پر بڑے بڑے جاگیرداروں،سرمایا داروں ،بڑے بڑے افسروں اور سرداروں نے تعمیر کرر کھا تھا-ارتکاز دولت و قوت ان کا مقصد حیات تھا-اور اس دولت و قوت کے بل پر یہ اکثریت کا استحصال کرنے سے کبھی نہیں تھکتے تھے-ایسے لوگوں کے ساتھ میری بےزاری میں روزبروز اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا تھا-میرے ذھن پر بہت سے سوالوں نے دستک دینا شروع کرر کھی تھی-ان سوالوں نے میرے ذھن میں ایک کھلبلی مچارکھی تھی-

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے کہ ان سوالوں کی اٹھان اس وقت ہونا شروع ہوئی جب میری دادی نے مجھے اسکول کے زمانے میں بنی اسرائیل کے انبیاء کی کہانیاں رات کو سنانا شروع کیں-اور اسی راستے سے وہ بنی اسماعیل کی کہانیاں بھی بیان کرتی گئیں-ہاجرہ،ابراہیم اور اسماعیل کا سفر حجاز بھی انھی دنوں سنا-اور یہیں سے آگے بنو ہاشم اور پھر محمد وآل

محمد کے قصے بھی ان سے سنے-ان قصوں میں سب
کی درویشی،فقر،عسرت اور قناعت کے پہلو بار بار
سامنے آئے-بعد میں "موسی سے مارکس" تک جب
پڑھی تو معلوم ہوا کہ اس کا مغز بھی ان کہانیوں میں
بیان ہوا تھا-اب ایک تو یہ عہد تھا جو ان کہانیوں کا
محور تھا اور ایک وہ عہد تھا جس میں میں سانس لے
رہا تھا-ایک اس عہد کے اندر سیرت محمد و آل محمد
تھی اور ایک اس عہد میں ان کے ماننے والوں کی
سیرت تھی-مجھے دونوں میں بعدالمشرقین محسوس
ہوا-مجھے لگا کہ میرے عہد کے لوگوں نے تو سب
کچھ ہی مسخ کرکے رکھدیا ہے-اور اس عہد کی سیاہ
شیعت کے گرد تقدیس کا جھوٹا ہالہ ہے جس کو بے
نقاب کرنے کی ضرورت ہے-اس سیاہ شیعت کے
حاملین کے پاس سیرت کا وہ نمونہ اور ماڈل تھا ہی
نہیں جو میں نے ان کہانیوں میں دیکھا تھا-میں نے یہ
سوالات جب اپنے اردگرد بڑے لوگوں سے کرنے
شروع کئے تو انہوں نے ان سوالات کو گستاخی کے
زمرے میں شمار کیا اور اس پر جب میں نے یہ

سوالات اور زیادہ شدومد سے اٹھائے تو کہا گیا کہ
اصل میں ناستک جراثیم پوتے میں عود کرآئے ہیں-یہ
سوالات میں نے دادا،دادی سے بھی کئے تھے-مجھے
اندازا نہیں تھا کہ وہ تو اپنی جوانی میں ہی اس
مہاجنی،قبیلہ پرست،نسل پرست سیاہ شیعت پر تین
حرف بھیج چکے تھے-اور بغاوت کا جہاں دریافت
کرچکے تھے-وہ میرے سوال خندہ پیشانی سے سنا
کرتے اور اوروں کی طرح "لاحول "نہیں پڑھا کرتے
تھے-ان کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں
نہیں پھوٹا کرتی تھیں-گلے کی رگیں پھولتی نہیں تھیں-
نہ ہی شدت غیظ سے ہونٹوں سے جھاگ بہنے لگتا تھا-
ان سوالوں کو سنکر میرے دادا کی آنکھوں میں ایک
شرارتی چمک آجایا کرتی تھی اور دادی کے لب زرا
کھینچ سے جاتے اور بہت میٹھی سی مسکان چہرے پر
سج جایا کرتی تھی-دونوں کہتے

عامی(میرا یہی نام لیکر بلایا کرتے تھے اور شاید یہی"
نام مجھے خواص میں ہونے کے فریب میں مبتلا ہونے
سے بچائے رکھنے میں معاون ہوا)تمہارے سوالوں

میں ہی تو جواب چھپے ہوئے ہیں-بیس کمی تمہارے دھیان کی ہے-ایک آنچ کی ضرورت ہے -یہ آنچ جس "دن میسر آگئی اسی دن آگہی کا ظرف پختہ ہوجائے گا

آج جب یہ ذاتی روداد لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ جملے میرے کانوں میں گونج رہے ہیں-سارا منظر میرے سامنے پھر سے روشن ہوگیا ہے-اور ان جملوں کی صداقت آنے والے دنوں میں ثابت ہوگئی-دادا اور دادی نے میرے سوال کرنے کی عادت کو کبھی کچلنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس پر کبھی اظہار ناراضگی کیا-بلکہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ دادا نے کہا تھا کہ

عامی!یہ جو نفی ہوتی ہے یہ سوال کا منطقی نتیجہ ہوا" کرتی ہے اور ہر نفی کے بعد اثبات کچھ وقعت پالیتا "ہے

بہت عرصے بعد شریعتی کو پڑھتے ہوئے معلوم پڑا کہ لا کہنے کی اہمیت اسلام اور تشیع میں کس قدر -اہمیت کی حامل ہے

میرے بابا اور اماں کل بھی میرے سوالوں پر ناراض تھے اور آج بھی ہیں-میری تمام تر سعادت مندی کا اعتراف کرنے کے باوجود میرے سوالات ان کو تکلیف دیتے ہیں-ان کی جانب سے میری بغاوت کی حوصلہ افزائی کبھی نہیں ہوئی-ان کے ہاں مولوی اور پیر آج بھی اعتبار کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہیں-ان کے بارے میں سوال اٹھانا بے ادبی ہے-

سوال اٹھانے کی آزادی اور آزاد خیالی یہ دو ایسے تصورات ہیں جن سے پیشوائیت کو ہمیشہ سے چڑ رہی ہے-اور مسلم سماج جب سے زوال پذیر ہوا اور نوآبادیاتی نظام نے پدرم سلطان بود والوں کا بھرکس نکالا تب سے تو یہاں تنگ نظری اور پسماندہ سوچ کی پوجا شدت اختیار کرگئی ہے-ترقی کرنے والی اقوام میں کیڑے نکالنا اور دوسروں کو اپنے زوال کا دوش دینا یہ اجتماعی رویہ بن گیا ہے-ہمارے ہاں "مسلک،فرقہ،اسکول آف تھاٹ"اصل میں فکری آزادی اور اجتہاد کے لیے کال کوٹھڑیاں بن چکے ہیں-بلکہ یہ ایس دلدل ہیں جس میں سماج کا پورا وجود دھنس چکا

ہے-یہ ایسا جوھڑ ہیں جہاں سے اب تعفن اور سڑاند
سے دم گھٹنے لگا ہے-سوال کرنے والوں کے لیے
ماضی میں زندان ہوا کرتے تھے اب طالبان ہوا کرتے
ہیں جو زندان کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے قصّہ ہی
تمام کردیتے ہیں-

ہمیں ایسے تعفن و سڑاند والے جوھڑ کو صاف کرنا
ہے-اور ایسی کال کوٹھڑیوں کو گرانا ہے جبکہ
سوالات کے ہتھوڑے کو اور زیادہ شدت سے استعمال
میں لانا ہے-میں نے ایسا ہی کیا تھا اور کرتا آیا ہوں-
اسی لیے سڑاند اور تعفن کو کبھی خوشبو اور راحت
بخش خیال نہ کیا-

میرے سوالات نے مجھے ایک راہ دکھائی اور
محمد،علی،فاطمہ یہ ایسے کردار تھے جو میرے
آدرشوں کی تشکیل مین اہم ترین کردار ادا کررہے
تھے-ان کے اردگرد بہت سارے روشنی کے مراکز
تھے جن سے میرا تعلق بہت زیادہ بڑھنے لگا-یہ ٹھیک
ہے کہ میں نے ان کرداروں سے مساوات،وحدت اور
عدل جیسے تصورات کی مثالی شکلیں دیکھ لی تھیں

مگر ان کرداروں کی معرفت اور ان سے شناس ہونے کی وہ منزل نہیں آئی تھی جس کا مجھے ادراک نہیں تھا-

پھر چودہ سال کی عمر میں اپنے میں ماموں کے ہاں مفتی جعفر حسین کے ترجمے کے ساتھ نہج البلاغہ سے تعارف ہوا اور اس کے بعد ایک شادی میں شہر بانو کے ساتھ مکالمہ ہوا-جس کا زکر ایک الگ باب میں اس کتاب میں موجود ہے-میں نے "ناتمام "کے نام سے ایک اپنے فکری ارتقاء پر تھوڑی سی روشنی ڈالی ہے-اس کو بھی مقدمہ کے فوری بعد آپ ملاحظہ کریں گے-مگر نہج البلاغہ سے دلچسپی ٹھیک طرح سے جس واقعے کے بعد ہوئی اس کا تذکرہ بہت ضروری ہے اور آپ اس کو نیچے ملاحظہ کریں گے-

21-رمضان المبارک کی رات تھی-اور ان دنوں بھی رمضان کے روزے زرا بہار میں آئے تھے-مگر رات نسیم بحری سے خوشگوار تھی-میں اور ایک اور دوست ہما علی کے گھر گئے اور ہما علی نے کہا تھا کہ ان کے ہاں آج شب بیداری ہوگی-وہ شب ہم نے ہما

کے گھر میں بنے ریڈنگ روم میں گزاری جہاں ہما
کی والدہ بھی موجود تھیں-آنٹی زھرہ نے اس رات "نہج
البلاغہ"کے پہلے خطبے پر بات چیت کی اور اس میں
تصور توحید ان کا موضوع تھا-اس رات مسائل کی
گتھیاں سلجھانے والا ڈور کا سرا ہاتھ آیا تھا-رات
گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور میں نے "نہج
البلاغہ"مستعار مانگ لی-اس پر آنٹی زہرہ نے فوری
طور پر بے ساختہ ایک جملہ کہا جو آفاقی حثیت کا
حامل لگتا تھا

بیٹا!کچھ کتابیں مستعار لیکر پڑھنے کی نہیں ہوا"
کرتیں ہیں-ایسی کتابیں تو ہمہ وقت سرہانے رکھی ہوتی
ہیں-اور ان کی روز قرات نئے نئے حقائق منکشف
کرتی ہے-میں آپ کو نہج البلاغہ کا ایک نسخہ بطور
"تحفہ دوں گی

اگلی صبح ہماء کے گھر سے جب ہم سب جانے لگے
تو آنٹی زہرہ نے ایک بہت خوبصورت جلد والا "نہج
البلاغہ"کا نسخہ میرے حوالے کیا-یہ بیروت سے چھپا
ہوا ہے-آج بھی یہ نسخہ میرے پاس ہے-اور آنٹی زہرہ

کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس کی
-قرات کو اپنا معمول بنا رکھا ہے

نہج البلاغہ نے ایک روشنی کے استعارے کے طور
پر کام کیا-اور اس روشنی میں میں نے کتب
تواریخ،کتب ہائے احادیث و تفسیر اور فقہ میں امام علی
کے اقوال،خطبات،خطوط کی تلاش شروع کردی-اور
یہ کوشش "علی شناسی"کے مکتب میں داخلے کی
-سبیل بن گئی

صحبت فکر باب العلم""میں جو وقت گزرا وہ بہت
قیمتی ہے-اس نے باطن کی اس آنکھ کو کھولنے میں
میری مدد کی جس کے کھلنے کی آس گھر سے بے
گھر ہونے والوں کو بہت زیادہ رہی ہے-بعض اوقات
معانی کا نزول اچانک ہوا اور کبھی کبھی یوں بھی ہوا
کہ خواب میں بھی "علی شناسی"کا عمل جاری و ساری
رہا-اس دوران جتنے نقش عیاں ہوتے آنکھ کھلنےپر وہ
یاد رہتے اور میں ان کو قرطاس پر منتقل کرتا رہتا
-تھا

لیکن یہ کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ اس سارے انکشاف کو ایک مربوط شکل میں لکھا جائے اور اس کو کتابی شکل دی جائے-مگر گذشتہ سے گذشتہ محرم الحرام شروع ہونے سے کچھ عرصہ قبل مجھے دوسب احباب نے کہا کہ میں "حسینت اور عصر حاضر"پر پہلی محرم سے لیکچر دوں اور اس کو دس تاریخ تک دس لیکچر کی شکل دے ڈالوں-میں نے ایسا کرنا شروع کیا اور یہ دس لیگجر جب ظہور پذیر ہوئے تو مجھے خیال آیا کہ علی شناسی کے سلسلے کو آگے بڑھانا چاہئے-اس سلسلے میں وجاہت سید سے بات چیت نے بھی کام کو آسان بنانے میں مدد کی-اور ایک طرح سے ان کے مسلسل اصرار اور ترغیب دلانے کی وجہ سے میں نے کام تیزی سے کیا-اس دوران جب میں علی شناسی کو ایک مکتب کے دور لینے کی سعی کررہا تھا تو بہت ساری نئی باتیں بھی میرے سامنے -آئیں اور ان کو بھی میں نے شامل کرلیا

علی شناسی کو ایک مکتب کے طور پر جاننے کا سلسلہ ڈاکٹر علی شریعتی کے مربوط مطالعہ سے

شروع ہوا-اور اس میں ان کی پہلی کتاب "سرخ شیعت و سیاہ شیعت"بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور یہ مجھے ہما علی نے دی تھی-اور پھر طاہر یزدانی (جو شریعتی کے سچے اور مخلص پیرو ہیں) کی وجہ سے میں علی شناس ہونے کی تمناء اپنے اندر جگا پایا-

شہر بانو کا بھی اس سلسلے میں میں احسان مند ہوں کہ ان کی نہج البلاغہ کے مطالب سے آشنائی اور اکثر میرے ساتھ تبادلہ خیال بہت ممدومعاون ثابت ہوتا رہا-شہر بانو کی پی ایچ ڈی کا تھیسس بھی اسی موضوع پر تیار ہونا تھا مگر شومئی قسمت موت کے فرشتے نے مہلت نہ دی-میں نے "علی شناسی"کی صورت اس قرض کو اتارنے کی کوشش کی ہے جو شہر بانو کی موت کی وجہ سے میرے کندھوں پر تھا-

ہما علی جب کینسر سے جنگ کررہی تھی اور کینسر وارڈ پر موت کی پرچھائیں بہت گھری معلوم ہوتی تھی تو اس کے بیڈ کے ایک طرف میں سڈول پر بیٹھ کر جب زرا فکرمند ہونے لگتا اور مایوسی کے بادل میرے وجود کو گھیر لیتے تھے تو ایسے ہما علی"علی

شناسی"کے باب میں موت بارے علی کے فلسفے کو
کھولنے لگتی تھی اور نہج البلاغہ سے اقتباس ڈھونڈ
کر لاتی اور مجھے اپنی یاداشت کے غضب کے ہونے
سے حیران کرتی اور میں بھی بچے کی طرح فوری
بہل جایا کرتا تھا اور میں یہ بھی ایک لمحے کے لیے
فراموش کرجاتا کہ میں کینسر وارڈ میں ہوں اور میری
سب سے گہری دوست بلڈکینسر کی آخری سٹیج پر
سامنے بیڈ پر لیٹی ہوئی ہے-اور جس عذاب سے وہ
گزر رہی ہے اس کے تصور سے علاج کرنے والے
بھی کانپ جاتے ہیں-مجھے لگا کہ "معرفت علی"کے
جو در ہما علی کی مجلس میں واہوئے تھے ان کو
لوگوں کے لیے کھولنا میرا فرض بنتا ہے-یہ فرض
کس حد تک میں ادا کرسکا اس کا فیصلہ تو آنے والا
وقت کرے گا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہما علی کی
شخصیت کا عکس ہے جو "علی شناسی"کے پس پردہ
کارفرما ہے-یہ کتاب اصل میں اس عکس کے منعکس
ہونے کا نتیجہ بھی ہے-

علی شناسی"کا سلسلہ اس کتاب پر ختم ہونے والا نہیں"
ہے-بلکہ یہ اس سے آگے جائے گا اگر توفیق اور مدد
-شامل حال رہی تو

میں علی عباس تاج،علی ارقم،عبداللہ
نیشاپوری،سیدضیاء حیدر زیدی،سید مصدق مہدی
جعفری،جلیس حاضر،عمران دھول،روما
رضوی،کامریڈ زوار حسین،انجم رضا ترمذی،کامران
خواجہ اور ان تمام احباب کا شکرگزار ہوں جنہوں نے
-اپنی محبتوں اور قیمتی مشوروں سے نوازا

وجاہت سید ایک نیک طینت روح ہے جس کی دوستی
اور جس کی اخوت میرے لیے نعمت کبیر سے کم نہیں
ہے-اور وہ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے سچے شیعہ
ہیں-ان کا ساتھ نہ ہوتا تو یہ کتاب کبھی بھی مرتب نہ
ہوپاتی-ان کا اصرار تھا اور ان کی توجہ بھی تھی-
میری بہت تمنا ہے کہ وہ اور میں پہلے نجف اشرف
اکٹھے ہوں اور علی شناسی پر مکالمہ کریں اور پھر
کربلاء پہنچ کر "فکر حسین "پر بات کریں-اور آخر
میں مشہد جاکر امام علی رضا کے مزار کے صحن

میں ایک نشست رکھیں-یہ خواب کب پورا ہوگا اس کا
تو معلوم نہیں ہے مگر خواب تو دیکھا جاسکتا
ہے،آرزو تو کی جاسکتی ہے اور تمنا کو سینے میں
داغ کی طرح رکھا تو جاسکتا ہے-

میری خواہش ہے کہ "علی شناسی"پر میری یہ کاوش
ہماری نوجوان نسل کے پاس زیادہ سے زیادہ پہنچے
تاکہ وہ "فکر علی "کی آفاقیت اور عالمگیریت کو قبیلہ
پرستی،نسلی دائروں سے بلند ہوکر دیکھنے کے قابل
ہوسکے اور اسے رسمیت پسندی سے نجات ملے-میں
نے اسی لیے اس کتاب کے حجم کو کم رکھا ہے تاکہ
تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی بات سمجھ آسکے-
نوجوان نسل اگر میرے مدعا کو پاجاتی ہے اور پھر ان
نوجوانوں میں سے کچھ لوگ اگر انقلابی راہ اختیار
کرتے ہیں اور سرخ شیعت کا دامن تھام لیتے ہیں تو
میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہوگئی-

آخر میں مجھے اپنی شریک حیات صائمہ بتول کا
شکریہ بھی ادا کرنا ہے جو اس کتاب کی تشکیل کے
مرحلے میں میری بے ترتیب کتابوں سے میری مطلوبہ

کتب کی تلاش کرکے مجھے دیتی رہیں اور میرے راتوں کو دیر تک جاگنے پر میرے منع کرنے اور ان کے اٹھکر چائے بنانے پر غصّہ کے باوجود چائے کا تھرموس میری میز پر لاکر رکھتی رہیں اور پھر ٹی-بریک لینے پر مجبور کرتی رہیں-میرے ساتھ ساتھ ان کی شب بیداری بھی ہوتی رہی-ان کی قربانی اس لیے بھی مجھ سے زیادہ بڑی ہے کہ وہ سارا دن ڈومیسٹک لیبر بھی کرتی ہیں-اور معصوم شاویزتقی اور عاشور حسین کو بھی سنبھالتی ہیں-اگر وہ معاون نہ ہوں تو لفظوں کی تشکیل گری ممکن نو ہو-یہ کتاب ان کی محنت کا بلواسطہ نتیجہ بھی ہے-

عامر حسینی

345-طارق آباد خانیوال

lailonihar@gmail.com

ناتمام

علی شناسی بارے کتاب مرتب کرتے ہوئے سوچا تھا کہ ایک باب اپنے فکری ارتقاء کے بارے میں بھی رقم

کروں گا-اب جب یا عنوان قائم کرڈالا تو سوچ رہا ہوں
بات کہاں سے شروع کروں-کیونکہ اس سے اپنے اور
اپنی فکر بارے چند جھلکیاں بھی دکھانا مقصود ہے-
میں اپنا پہلا مجموعہ شایع کرنے جارہا ہوں-اتنے سال
میں اگر یہ پہلی کتاب ہے تو قصووار تھوڑا میں ہوں
اور زیادہ دوسرے ...کیسے ذرا صبر کرلیجئے پلے
اپنی کتاب زندگی کے کچھ ابواب میں سے چند جھلکیاں
- تو دیکھ لیجئے

بچپن کی چند یادوں کو آپ سے شیئر کرنے میں کوئی
حرج نہیں ہے-ہمارا گھر جس گلی میں تھا اس کی
سامنے والی گلی میں ایک وکیل صاحب کا گھر تھا-
وکیل صاحب کا نام مجید انورتھا-ایک مرتبہ ایم پی اے
بھی رہ چکے تھے-شیخ رشید بابائے سوشلزم کے
ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے-بھٹو صاحب کو جس دن
پھانسی ہوئی تو یہ عجب وحشت کے عالم میں گھر
سے باہر چوک میں آگئے اور کہنے لگے "وقت کے
" قاضیوں نے آج پھر ایک منصور کو پھانسی چڑھا دیا
میں کم سن تھا میرے کانوں میں جب یہ جملہ پڑا تو
مجھے اس وقت سمجھ نہیں آئی تھی کہ قاضی کون
ہوتے ہیں؟منصور کون تھا ؟اور یہ پھانسی کیا ہوتی
ہے؟

میرے ایک چچا دائیں بازو کی تنظیم سے وابستہ تھے
وہ گھر آئے اور کہنے لگے "مجید تو سوشلسٹ
ہے،دہریہ ہے،مسجدوں کو لینن گراڈ میں بدلنا چاہتا
ہے"
ہمارے گھر کے قریب ایک چوک تھا جو کہ ایک طرح
سے ہائیڈ پارک تھا-سیاسی،سماجی اور مذہبی جلسے
جلوسوں کا مرکز تھا-اس چوک میں ایک طرف ایک
بلڈنگ تھی جس پر پیپلز ہاؤس لکھا تھا-یہاں پر ایک
صاحب نور محمد چوہان رہتے تھے-شہر کے لوگ ان
سے بھی ذرا کھنچے کھنچے رہتے تھے-ایک مرتبہ
میرے پڑوس میں رہنے والے حاجی صاحب میرے دادا
کو کہنے لگے "یہ چوہان بہت برا آدمی ہے،رب کی
تقسیم کو چیلنج کرتا ہے،سب کو برابر کرنے کی بات
کرتا ہے،ان سرخوں کو تو برابری کا جنون ہے"
بچپن کی ایک اور یاد میرے ذہن سے چپکی ہوئی ہے-
محرم کی نویں رات تھی-شہر میں خوب رونق تھی میں
اپنے ماموں کے ساتھ امام بارگاہ آیا ہوا تھا ماموں کے
ایک دوست بو علی تھے-وہ امام بارگاہ کے باہر ماموں
کو مل گئے-اور میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا
"عمران!یہ تعزیہ ،زیارت،شبیہ،علم علامات اور رمز
رکھتی ہیں،مگر رمز اور علامتیں تو کہیں گم ہیں

صرف نمود و نمایش رہ گئی ہے،کربلا
،کوفہ،شام،دربار یزید،یزید،ابن زیاد،شمر،امر سبھی تو
ہیں مگر حسین ،مسلم بن عقیل بیمار عابد ،زینب کوئی
" بھی موجود نہیں ہے
ماموں عمران ان کی بات سننے کے بعد کہنے لگے
کہ"بو علی شریعتی مت بنو کیوں خود پر بے دیں ہونے
کافتویٰ لگوانا چاہتے ہو-آنسو بہاؤ ،سینہ کوبی کرو،ہو
"سکے تو زنجیر چلاؤ،بس یہی بہشت کا سامان ہے
ماموں عمران آج بی مجلس سنتے اور آنسو بہاتے اور
زیارت کرتے ہیں اور سامان بہشت کرتے ہیں-بو الی
بھی کسی فتویٰ سے محفوظ رہے مگر نوے میں ان
کو ایک سپاہ کے مجاہدوں نے زندگی کی قید سے آزاد
کر دیا اور وہ رسوم پرستی کے خلاف جنگ کی وجہ
سے مومنین کے غیض کا نشانہ بننے کی بجائے شہید
ملت جعفریہ بن گئے-ان کی اولاد شہید کی برسی پر
آنسو بھی بہاتی ہے اور سامان بہشت کے دوسرے
-ضابطے بھی خوب پورے کرتی ہے
میرے پرائمری کلاس کے ایک استاد تھے محمد
شریف،سردی،گرمی،آندھی ،طوفان،بارش کچھ بھی ہو
وہ بیس میل سائیکل پر سفر کر کے آتے اور ہمیں
پڑھاتے تھے-اردو الفاظ کا ایک خزانہ تھا ان کے پاس

جو انھوں نے ہم بچوں کو منتقل کر ڈالا تھا-اسکول میں
وہابی مشہور تھے -اب یہ وہابی کیا ہوتا ہے ہمیں خبر
نہیں تھی-ہمارے درمیان ایک ارسطو کی طرح کا لڑکا
تھا وہ بہت دور کی کوڑی لاتا تھا-کہنے لگا کجو بیس
میل سائیکل چلاتا ہو،بچوں سے ٹیوشن فیس نہ لیتا ہو
اس کو وہابی کہتے ہیں"ہم بچے اپنے اس ہم جماعت
-کی علمیت سے مرعوب تھے فوری مان گئے
میری ایک استانی تھیں ان کو ہم بچوں کی لغت اور
لہجہ ٹھیک کرانے کی فکر کے ساتھ ساتھ ہماری
نشستن،گفتن،خوردن اور زینت لباس کی بھی بہت فکر
رہتی تھی وہ کہتی تھیں:اخلاق میں کجی آپ کے انسان
"ہوے کو مشکوک کر ڈالتی ہے

ایک پطرس سندھو تھے انگریزی کے استاد ،وہ ورڈ
آف دی ڈے کے سلسے کو ہماری نوٹ بک میں درج
کرانے اور ہمیں لغت انگریزی کو استعمال کرنے کی
عادت ڈالنے میں ساری توانائی خرچ کر دیتے تھے-اس
زمانے کی ایک جیبی لغت آج بھی میرے پاس موجود
ہے

میٹرک تک آئے تو ایک عجب واقعہ ہوا-میں انگریزی
جن صاحب سے پڑھتا تھا ان کا نام تھا سعید الرحمن

تھا اور وہ جماعت اسلامی میں تھے-جبکہ میں ریاضی
ایک خاتون
شائستہ زمان سے پڑھتا تھا جو بہت پروگریسو خاتوں
تھیں-
استاد ہمیں مولانا مودودی کی بکس دیتے تو استانی
ہمیں سبط حسن،صفدر میر ،سجاد ظہیر کی کتابیں دیتی
تھیں-
ایک دن استانی نے مجھے "اشتراکی منشور "دی اور
میں نے اس کو بیالوجی کی کتاب میں رکھ کر پڑھنے
کی کوشش کی"یورپ کے سر پر ایک بھوت منڈلا رہا
ہے ،کمیونزم کا بھوت "تمام معلوم انسانی تاریخ طبقات
کے درمیان کشمکش کی تاریخ ہے"
ہ کتاب بہت مختصر تھی اور کچھ سمجھ میں آئی اور
کچھ سمجھ میں نہیں آئی،استانی جی نے بعد میں بہت
سے مقامات کی مشکلات حل کرنے میں مد کی-
ایک قاری صاحب تھے جو ہم بچوں کو گھر پڑھانے
آتے تھے-کہنے کو مولوی صاحب تھے مگر مولویوں
کے سخت خلاف تھے-کپڑ ے کی دکان تھی ،قران فی
سبیل اللہ پڑھاتے تھے-والد صاحب نے ان کو کہا کہ
ہمیں تاریخ اسلام بھی پڑھا دیں-ایک تاریخ وہ تھی جو
ہم درسی کتابوں میں پڑھ رہے تھے اور ایک قاری

صاحب پڑھا رہے تھے-قاری صاحب کی تاریخ بہت
مختلف تھی-ماضی ویسا ہموار نہیں تھا جیسا بتایا جاتا
تھا-تاریخ کی جو اے بی سی یا ابجد قاری احمد نے
ہمیں سکھائی وہ کئی علامہ اور فاضلین بھی نہ سکھ
-سکے
میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا جب قاری احمد ایک
عرصۂ بعد میرے گھر آئے تھے-میرے ہاتھ میں مختار
مسعود کتاب لوح ایام تھی-دیکھ کر کہنے لگے علی
شریعتی بارے پڑھا؟میں نے کہا ہاں تو کہنے لگے او
ذرا باہر چلتے ہیں-میں ان کے ساتھ باہر چلا گیا رستے
میں وہ ایران بارے بولنا شروع ہوئے-بات فتح ایران
سے شروع کی اور اس دوران بہت سے نازک مقامات
بھی آئے-اور چلتے چلتے علی شریعتی تک ان پہنچے-
میں دوسری مرتبہ علی شریعتی کا نام سن رہا تھا-وہ
جب شیعہ مذھب پر بات کررہے تھے تو مجھے بو
علی یاد آرہے تھے-مجھے لگا تھا کہ بو علی
-نے شریعتی کے فقرے مستعار لئے تھے
میں نے چچا بو علی سے پوچھا بھی تھا-وہ شریعتی کا
نام سنکر چونکے تھے اور مجھ سے پوچھا یہ نام
مجھے کہاں سے معلوم ہوا؟ میں نے تفصیل بتائی تو
کہنے لگے کہ "ابا میاں کو مت بتانا کہ تم شریعتی کو

پڑھتے ہو-پتہ چلا تو ناراض ہوں گے ،میں نے بھی درسی کتب میں رکھ کر کر شریعتی کی کتابیں پڑھیں-ابا میاں رات گئے تک میرے پڑھنے کو دیکھکر خوش ہوتے تھے-ان کو کیا معلوم تھا کہ میں میتھ ،انگریزی کی کتب میں "علی کی تنہائی"اور غریب ربذہ کی غریب الوطنی کا احوال پڑھا جارہا ہے

انہی دنوں میں نے شہید مرتضیٰ مطہری ،باقر صدر ،ڈاکٹر بہشتی کو پڑھا-ان لوگوں کو پڑھنے کے دوران ہی عرب ملکوں میں اصلاح پسندوں اور برصغیر کے اصلاح پسندوں کو دیکھنے کا عمل شروع کردیا-شاہ ولی اللہ سے لیکر سر سید اور پھر دور حاضر کے مودودی تک کے کام کو دیکھا اور پھر اسی دوران دادا ،دادی کے رجحانات کے زیر اثر مارکسزم سے بھی آشنائی ہونے لگی-چونکہ یہ ایک الگ کہانی اور باب ہے اس کا تذکرہ میں نے جان ریس کی کتاب "انقلاب کا الجبراء"کے ترجمے کے مقدمہ میں کیا ہے-جب -چھپ کر وہ کتاب آئے گی تو آپ پڑھ لئجئے گا

میں نے علی شناسی کی منزل ایک دن میں حاصل نہیں کرلی –یہ منزل اگر میں ماہ و سال کا حساب کرنے بیٹھوں تو 20 سے 25 سال کی محنت شاقہ کے بعد

حاصل ہوئی ہے-اور اس منزل کے حصول میں
درجنوں لوگ اور سینکڑوں کتب کی معاونت شامل ہے
---جن کے ناموں سے ہی ایک الگ کتاب بن سکتی ہے

امام علی اور اور ان کا مکتبہ فکر

دوستو"آج کی اس محفل میں ہم ایک ایسے موضوع پر
بات کرنے جارہے ہیں جس پر بات کرنے کا حق نہ
کبھی ادا ہوسکا نہ ادا ہوسکے گا-آج کی رات بھی بہت
اہم ہے-یہ تیرہ رجب کی رات ہے-اس رات کو ہمارے
موضوع میں زیر بحث شخصیت نے جنم لیا تھا-
موضوع پر جانے سے پہلے میں آپ کو کچھ اہم باتیں
مقدمات کے طور پر کرنا چاہتا ہوں-سب سے اہم اور
بنیادی بات یہ ہے کہ مذہب کوئی بھی ہو اس میں
رمز ،کنایہ،استعارہ ،تشبیہ ،مجاز ،علامت بہت اہمیت
کی حامل ہوتی ہیں-مذہب اس کے بغیر نہ تو ایک زندہ
اور قبل تقلید مکتب کے طور پر زندہ رہ سکتا ہے-نہ
ہی مذہب اس صورت میں کوئی کلچر اور تہذیب کا جنم
داتا بن سکتا ہے-لیکن ایک بات اس کے ساتھ اور
سمجھنا ضروری ہے کہ ایسا مذہب ،یا مکتب جس کی

بنیاد بغاوت ،مزاحمت اور انقلاب پر رکھی گئی تو اس
کے اندر رمز،کنایہ ،تشبیہ ،استعارہ ،مجاز،علامت اور
کئی پرتوں کے ساتھ گھلے،ملے لفظوں سے بننے والی
متھ اور اسطور بہت زیادہ ہوا کرتی ہے اور یہ اس
مکتب کی جان ،مغز اور روح ہوا کرتی ہے-تاریخ ہمیں
حق اور باطل دونوں کے بارے میں ایک بہت دلچسپ
بات بتاتی ہے-اور وہ بات یہ ہے کہ باطل جب
حکومت کر رہا ہوتا ہے تو بغاوت کرنے والے
مزاحمتی مکتب فکر کی متھ کو جس میں رمز
، کنایہ ،تشبیہ ،استعارہ ،مجاس
علامت سب شامل ہوتی ہیں ان کو مسخ کرنے کی
کوشش کرتا ہے-وہ اس مکتب فکر کے بانی اور اس
کے نائبین اور آئمہ کو اس متھ سے الگ کرنے کی
کوشش کرتا ہے-تیسری بات جو بہت اہم ہے وہ یہ ہے
کہ باطل کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ پیورٹن طریقے
سے باغی مکتب کی تردید کرے اور وہ اس کوشش
میں مذہب کو تاریخ سے ،کلچر سے اور تہذیب سے
بلکہ ایک صحت مند زندگی سے دور لیجانے کی
کوشش کرتا ہے-وہ مذہب کی الہامی کتابوں کے متن
کو اور اس کے بانی کی گفتگو کو رمزیت ،اسرار اور
بھید سے پاک دکھانے کی کوشش کرتا ہے-اور لفظوں

کے ظاہر کو ہی اصل شے دکھانے پر اصرار کرتا
ہے-
میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو میرے ان مقدمات کے
سیاق و سباق کی سمجھ آرہی ہوگی-اور ان مقدمات کی
روشنی میں آپ امام علی اور ان کے مکتب کے بارے
میں بہت سارے نتائج اخذ کر رہے ہوں گے-
میں نے علامت کی بات کی تھی-آپ دیکھ سکتے ہیں
کہ امام علی کے مکتب میں تاریخ ،دن،ماہ ،سال سب
کے سب محض اعداد وشمار والی چیزیں نہیں رہ
جاتے بلکہ وہ بہت گہری علامتوں میں بدل جاتے ہیں
اور ان کے معنی سی بھی مزاحمت کی خوشبو آنے
لگتی ہے-آج تیرہ رجب ایک تاریخ اور ماہ کا نام نہیں
ہے اور نہ ہی یہ صرف ایک شخص کی ولادت کا نام
ہے-بلکہ اس میں پورا مکتب اور اس کی پوری متھ کی
ولادت کے معنی بس گئے ہیں-آخر پوری تاریخ اور
اس میں آنے والے سارے ماہ و سال ایک اسطور اور
ایک متھ کیسے بن گئے اور کیوں بن گئے؟یہ جاننے
کے لئے آپ کو تاریخ کو گہری نظر کے ساتھ پڑھنا
ہوگا اور آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سے باطل
اسطور بن جانے والی تاریخ کو مشخ کرنے اور اس کو
بدل ڈالنے کی کوشش کرتا رہا ہے-

تاریخ اسلام میں جب سرکار اور دربار نے سیدھے
سبھاؤ سے حقائق کو آنے نہیں دیا اور واقعات کو
بدلنے کی کوشش ہوئی-اور کئی نام تاریخ سے مٹانے
کی کوشش کی گئی-اور ان کو درج کرنے والوں کو
سزائیں ڈی گئیں کئی لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو
بیٹھے تو حق کے چاہنے والوں نے اسطور اور رمز
کو زیادہ لطاقت اور زیادہ نفاست کے ساتھ بیان کرنا
-شروع کر دیا
اگر آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امام علی کی
گفتگو بعد از وفات نبی زیادہ سے زیادہ رمزیہ اور
اساطیری رنگ اختیار کرتی چلی گئی-اس کی وجہ جبر
،ستم اور زبردست قسم کا ان دیکھا سنسر تھا-آپ کو
امام علی کی تنہائی کو مدینہ،مکہ اور پھر کوفہ میں
ذرا غور سے دیکھنا چاہیے-آپ کو معلوم ہوگا کہ امام
علی اپنے پیروکاروں کو جبر سے بچانے اور ان کو
آزمایش سے بچانے کی خاطر کس قدر
رمز،کنایہ،تشبیہ ،مجاز اور استعارہ سے کام لینے لگے
تھے-امام کی زندگی میں پیش آنے والے سارے کے
سارے واقعات جہاں مکتب امام علی کی تشکیل کا سبب
بن گئے ۔وہیں پر یہ واقعات بذات خود علامت ،استعارہ
اور رمز بن کر سامنے آگئے اور ان کے مخالف مل

کر اب انہی واقعات کی سب سے زیادہ تردید کرنے
کے لئے کوشاں ہوتے ہیں-امام علی کے باب میں یہ
بھی ہوا کہ ایک فقرہ حاضرہوں اور لاکھوں لکھے
ہوئے الفاظ پر بھاری ہوگیا-اور وہ فقرہ اپنے اندر امام
علی اور ان کے مکتب کی حقیقت کاملہ کو پنہاں کئے
ہوئے نظر آتا ہے-
واقعہ کے حوالے سے آپ دیکھیں کے نبی اور ابو
طالب کا جو رشتہ اور تعلق ہے اور ان کے ایمان یا
کفر کی جو بحث ہے وہ اپنی جتنی بھی اہمیت رکھتی
ہے اس کی وجہ امام علی کا ابو طالب کا بیٹا ہونا ہے-
اب اگر ابو طالب کو غیر اسلامی شخصیت ثابت کرنے
پر جو زور ہے اس کی سمجھ آتی ہے-اگر علی کے
والد ابو طالب نہ ہوتے تو ان کے ایمان کو تاریخ کی
اکثر سرکاری اور درباری کتب مان کر آگے چلتیں-
دوسرا واقعہ امام علی کی اپنی پیدایش کا ہے-مولود
کعبہ کا خطاب ان کے مخالفوں کو ہمیشہ پریشان کرتا
رہا ہے-اب یہ بھی صرف صفت نہیں رہی بلکہ اس
سے آگے جاکر رمز اور علامت بن گئی ہے-تیسرا
واقعہ دیکھیں وہ امام علی کے ایمان کی اولیت کا ہے-
اس پر بھی ایک لمبی بحث سامنے آئی وجہ صرف
علی تھے-اس سے آگے تیسرا واقعہ دعوت عشیرہ کا

ہے-اس دعوت میں علی کا اٹھ کھڑا ہونا اور پھر نبی
کا معروف جملے بولنا ایک علامت اور رمز ہیں جن
کو جھٹلانے کے لئے سر توڑ کوشش کی گئی-پھر
فقروں اور جملوں کی ابدی معنویت کو جھٹلانے کی
کوشش بھی کی جاتی رہی -میں آپ کے سامنے پیغمبر
کے چند جملے جو بہت واضح تھے اور بہت صاف
تھے پیش کرتا ہوں آپ کو خود اندازہ ہوگا کہ ان
جملوں کو سرسری جملے قرار دینے کی کوشش کیوں
ہوتی رہی اور اب تک کیوں کی جارہی ہے ؟

" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے"

جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے -جو علی"
سے عداوت کرتا ہے وہ مجھ سے اور اللہ سے عداوت
-کرتا ہے"

حق علی کے ساتھ ہے-جس طرف علی ہے -حق بھی"
اسی طرف ہے"

" علی سے مومن محبت کرے گا اور منافق نفرت"

اسی طرح آپ چادر میں اہل بیت کو چھپانے والے
واقعہ کو لیں اور مباہلہ کے لئے اہل بیت کے نام پر
جانے والے لوگوں کے نام اور اس واقعہ کو لیں ،پھر
غدیر کے واقعہ کو لیں اور رسول کی طرف سے اپنا
آخری اجلاس عام کرنے اور اس میں کتاب اللہ کے

ساتھ عترت اور اہل بیت کے ساتھ اخذ کرنے والے واقعہ کو لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان کو سرکاری اور درباری لوگوں نے غیر اہم واقعات بنانے کی کوشش کی-پھر کئی ایک نے ان کو جھٹلانے کی کوشش کی-اور جب کچھ بس نہ چلا تو جن جن اولین کتابوں میں ان واقعات کا یا جملوں کا ذکر آیا ان کو لکھنے والوں کو بے اعتبار کرنے کی کوشش ہوئی-اور پھر ان کتابوں میں سے میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا،کڑوا تھو "کرنے والی چالاکی اپنانے کی کوشش ہوئی-

بعد از وفات نبی سیقفہ اور نبی محترم کے جنازے کے واقعات کے درمیان جو نسبت اور تعلق بنتا ہے اس کو دانستہ الگ الگ دیکھنے کی کوشش بہت معروف ہے-اسی طرح سے خلافت کو منوانے کے لئے جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان کو بھی جھٹلانے کی بے تحاشا کوشش ہوئی-امام علی کی زندگی کا ایک ایک پل اسطور اور رمز بنا اور ان کی زندگی پوری کی پوری علامت نگاری کی مثل ہوگئی-اسی وجہ سے مسلم تاریخ اور مسلم فکر میں جس قدر گہری اور جاندار ثقافتی شخصیت امام علی کی ہے اور کسی کی نظر نہیں آتی ہے-

میرے دوست احباب جو خود بھی اہل علم و دانش ہیں
وہ سمجھتے ہیں کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ
میں ایک نشست میں اپنے مقدمات اور ان کے نتائج کو
کھول کر تفصیل سے بیان کروں -اس لئے میں بس
اشارے کرتا چلا جارہا ہوں-امام علی کا اور ان کے
مکتب کا سب سے بنیادی اور مغز کی حثیت رکھنے
والا وصف جو ہے وہ علم و فکر ہے -لیکن جب ہم ان
کے بنیادی وصف کو علم اور فکر کہتے ہیں تو یہ علم
اور فکر یکتائی اور عدل کی صفات کے بغیر سمجھ
میں آنے والے نہیں ہیں-یہی وجہ ہے کہ مکتب امام
علی میں توحید اور عدل کبھی ایک دوسرے سے جدا
نہیں ہوتے اور انسان کامل میں بھی یکتائی اور عدل
کی جدائی ناممکن خیال کی جاتی ہے-آپ اگر مکتب
علی کے نکتہ نظر سے امامت اور رہنما کے ایشو کو
دیکھیں گے تو بہت سارے اصولوں کی آپ کو سمجھ
آجائے گی کہ کیوں بہت سارے لوگ عادل اور توحید
کو الگ کرنا چاہتے تھے اور اس کو امام کی صفت
-بھی قرار دینے سے بھاگتے تھے

امام علی کا مکتب ثقافتی طور پر توانا اور بہت قوت
والا مکتب ہے-کیونکہ خود امام علی اپنی ذات کے
اعتبار سے ایک دیو مالائی سچ بنکر ابھرے-اگر میں

یہ کہوں کہ امام علی اور ان کے مکتب کی تاریخ اصل میں اساطیری بیانیہ کی تاریخ ہے تو غلط نہیں ہوگا-یہ اساطیری بیانیہ مکتب امام علی کے تمام تر ثقافتی زندگی پر چھایا ہوا ہے-اور یہ ثقافتی زندگی پورے سماج اور اس کے کلچر پر اثر انداز ہوتی ہے-مکتب امام علی ایک کلر فل اور ثقافتی دولت سے مالا مال کلچر ہے-یہ کلچر کلر فلنس اس کو ایک ارتقائی عمل سے حاصل ہوئی ہے-اگر آپ واقعہ کربلا کے متھ بن جانے اور اس سے نکلنے والی ثقافتی لہروں کو دیکھیں اور مشرق وسطیٰ سے لیکر برصغیر پاک و ہند کے سماج پر ان ثقافتی لہروں کے اثرات دیکھیں تو آپ کو میری کہی ہوئی بات کا اندازہ ہوگا-

میں آپ کو برصغیر کی ثقافت اور تہذیب پر مکتب امام علی کے اثرات کا جائزہ لینے کی دعوت ضرور دوں گا-اگر آپ عاشور ،مجلس،چہلم ،جلوس ہائے تابوت امام بارگاہ ،کربلا (کربلا گامے شاہ.
وغیرہ)،تعزیہ،علم ،ضریح ،شبیہ کے اساطیری معنی کو دیکھیں اور پھر برصغیر کے کلچر کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس قدر گہرے اثرات ہیں مکتب امام علی کی متھ کے کلچر اور ثقافت پر-مرثیہ ،سوز ،نوحہ کے اثرات بھی ہماری زبان اور ادب پر

دیکھے جاسکتے ہیں-میں یہ بھی کہتا ہوں کہ امام علی جب مدینہ سے کوفہ گئے تو ایک طرح سے مکتب امام بھی اپنی تمام تر رنگینی اور ثقافتی دولت کے ساتھ کوفہ گیا-اور حجاز کو چھوڑ کر باقی عرب خطہ میں اسی اسطور نے کلچر کو زیادہ امیر کیا ہے اور ثقافتی رنگا رنگی میں مکتب علی کا بھی بہت زیادہ ہاتھ ہے-جبکہ امام علی کے مکتب کے الٹ مکتب کا مولد و مسکن نجد نے پورے حجاز کو سرے سے ثقافت اور تہذیب کو بدویت میں بدلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے-

میں یہاں پر مکتب امام علی کے زیر اثر جنم لینے والی عسکری مزاحمتی تحریکوں اور مکتب نجد کے تحت اٹھنے والی عسکری تحریکوں کے درمیان فرق بارے بھی اپنے سننے والوں کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا-آپ حزب اللہ اور عمل کو دیکھ لیں اور اس کے مقابلے میں القائدہ اور ان جیسی دوسری سلفی عسکری تحریکوں کو دیکھ لیں -اول الذکر کلچر و تہذیب سے شیفتگی اور دوسری مذہبی کیمونٹیز کے ساتھ بہت بہتر تعلقات کی حامل ہیں-جبکہ موخر الذکر کا سب سے بنیادی ایجنڈہ کلچر اور تہذیب کو رد کرنا اور دوسری مذہبی و نسلی کیمونٹیز کا ختم کرنا ہے-

مکتب علی کی متھ اور رمزیت کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے-اور اس مکتب کے اولین امام سے لیکر آخری امام تک سب کی اساطیری شخصیتوں کے اساطیری پن کو ہٹانے کی کوشش ہوتی رہی ہے مگر اس دیو مالائی سچ کو ان سے الگ کرنا نامکن ہوگیا ہے-آج کی رات میں آپ سب دوستوں کو دعوت دیتا ہوں کے امام علی کی زندگی اور ان کی فکر کے اساطیری پہلو پر غور غوض کے لئے وقف کر دیجئے-آئیں ہم سب مل کر نہج البلاغہ میں متھ ،رمزیت اور چھپے بھیدوں کو تلاس کریں-متھ،رم،کنایہ آپ کو طاقت اور قوت فراہم کرتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ خود کو جذب کرنے کی حالت میں آجائیں-اور پھر یہ ایک طرح سے صاحب متھ اور صاحب رمز اور صاحب اسرار کے ساتھ بھی جڑنا ہوتا ہے-میں آپ سب دوستوں کا مشکور ہوں کہ آپ اس مبارک رات یہاں تشریف لائے اور مولود کعبہ اور مکتب مولود کعبہ کے ذکر میں مشغول ہوئے-

تیرہ رجب کی رات ایک مجلس دوستاں میں کی گئی)
تقریر ....مولود کعبہ کی فکر کو سامنے لانے کی
(ایک عاجزانہ سی کوشش

مکتب امام علی کا ثقافتی اثر و نفوز

عامر حسینی

تیرہ رجب کی رات کو جب ہم سب دوست ایک جگہ
اکٹھے ہوئے تو یہ بھی اتفاق تھا کہ جو بھی دوست
وہاں آئے وہ سب فلسفہ اور تاریخ کے طالب علم تھے-
بہت ساری باتیں اس دوران سامنے آئیں جو میں اپنے
فیس بک کے دوستوں کے ساتھ بھی شئیر کرنا چاہتا
ہوں-سیدہ رباب ترمذی نے میری اور دوستوں کی توجہ
اس امر کی جانب دلائی کے بہت سے ماہرین تاریخ
نے اس بات پر تحقیق کی ہے کہ مکتب امام علی کن
کن علاقوں میں اور کن کن طبقات کے اندر فروغ پذیر
ہوا-اور وہ اس بات کی بھی تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ
مکتب امام علی کے جو حامی ہوئے ان کو کس بات
نے زیادہ اس مکتب سے جڑنے کی ترغیب دی-اگر ہم
بات حجاز سے شروع کریں تو ہم مکتب علی کی
حمایت ایک طرف تو مکہ کے غریبوں میں بہت زیادہ
حمایت ملی تو دوسری طرف مدینہ کے انصار ان کے
حامی ہوئے-قبائلی سردار اور بدوی ان کے ساتھ نہیں
ہوئے-قبائلی سردار اور بدوی سردار اور بااثر لوگ
عرب ازم کے حامی بنکر ابھرے -اور پھر مکتب امام
علی کوفہ میں اور اس سے ملحقہ علاقوں کے ساتھ
ساتھ بصرہ میں پھیلا-کوفہ کے اندر مکتب علی کی

حمایت جنوبی عرب کے لوگوں میں زیادہ تھی-یہ
موالی کہلاتے تھے-ان میں غیر عرب لوگ بھی تھے-
اور ان میں وہ نو مسلم بھی تھے جو نئی مسلم فوج کا
حصہ بنے ،یا پھر چھوٹے تاجر کے طور پر ابھرے-
ان نو مسملموں کا سابقہ بھی ایک نہیں تھا-ان میں
کرسچن ،یہودی ،پارسی سبھی پاس منظر کے لوگ
شامل تھے-اب جو ملوکانہ اور بنو امیہ والا مذہب کا
برانڈ تھا وہ حجاز کو چھوڑ کر دیگر عرب یا غیر
عرب باشندوں کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا-پھر
وہ کوفہ اور بصرہ کے اندر جو کہ ایران میں اسلام
کے پھیلاؤ کے لئے انتظامی مرکز کا کردار ادا کر
رہے تھے ان کی جو شہری آبادی تھی اس کو ملوکانہ
گروہ کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھے-نسل پرستی
اور تعصب کی فضاء تھی-عملی طور پر جنوبی عرب
اور عجمی باشندوں کو اسلام کے عدل اور مساوات
کے تصور سے کوئی فائدہ نہیں ہورہا تھا-اب آپ
دیکھئے کے حضرت عثمان کے دور میں جب ان کے
خلاف ایک فضاء بنی تو اس فضاء میں پیش پیش
لوگوں کا تعلق عراق کے کوفہ اور بصرہ سے تھا-اور
اس دوران پہلی مرتبہ امام علی سے یہ لوگ رابطے
میں آئے-امام علی عثمان اور تحریک چلانے والوں

کے درمیان صلح جو کا کردار ادا کر رہے تھے-امام
علی وہ واحد آدمی تھے جنھوں نے پیغمبر کی وفات
کے بعد دیگر ملکوں پر حملے کی مہم جوئی میں
حصہ نہیں لیا تھا-اس دوران یہ یقینی بات ہے کہ امام
علی کے افکار سے ان لوگوں کو آگاہی حاصل ہوئی
اور عرب سامراجیت کے خلاف ایک راہ بھی ہموار
ہوئی-مکتب عام علی نے ایک متبادل نظریہ کا کام دیا
اور لوگ سرکاری اور درباری اسلامی فکر کی بجائے
اصل اسلامی فکر سے بھی آگاہ ہوئے-اسلام کا جب
آغاز ہوا تو اس کا سماجی پہلو یہ تھا کہ اس کے ماننے
والے وہ لوگ تھے جو مکہ میں قریشی قبائلی سرداری
نظام کے ستائے ہوئے تھے-اسلام نے مکہ کے ظالمانہ
سرداری نظام کو چیلنج کیا -یہ مذہب جب مدینہ پہنچا
تو وہاں اس نے یہودی قوم کے بیاج خوروں اور اس
اشرافیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا جو مکہ کے قبائلی
اشراف سے مل کر اس تحریک کو ختم کرنا چاہتے
تھے-یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے-اور وہ یہ
ہے قران خود بدوی اربوں کے بارے میں کہتا ہے کہ
وہ اطاعت پذیر تو ہوگئے تھے مگر اسلام ان کے دلوں
میں داخل نہیں ہوا تھا-اب خود ہم نے دیکھا کہ وفات
نبی کے بعد ایک طرف تو خود انصار کے خلاف

قبائلی اشرافی اتحاد بتدریج بنا-نظام خلافت سے مدینہ
والے عثمان دور میں سرے سے الگ کر دیے گئے-
اور اس کے ساتھ ساتھ کوفہ اور بصرہ کے علاقوں
اور اس سے ملحقہ علاقے کے لوگ بھی اس نظام سے
باہر کر دیے گئے-بنو امیہ کے دور حکومت کاجائزہ
لینا بہت ضروری ہے-اس دور میں مکتب امام علی کو
سرے سے ختم کرنے کے لئے ان تمام علاقوں میں
زبردست ظلم و ستم ہوا جہاں جہاں یہ مکتب اپنا قدم
جما چکا تھا-اس دوران یہ ہوا کہ ان علاقوں میں رہنے
والے ان مسلمانوں کے خلاف ایک پروپیگنڈہ مشین
بھی تیار ہوئی جس کا کام یہ تھا کہ امام کے مکتب
سے تعلق رکھنے والوں کے عقائد اور خیالات بارے
طرح طرح کے جھوٹ پھیلائے جائیں-ان کے عقائد کا
ماخذ یہودی ،پارسی اور مسیحی عقائد کو قرار دیا
جائے-اس کے ساتھ ساتھ جو بھی مزاحمتی تحریک بنو
امیہ کے خلاف کھڑی ہو اس کو غیر اسلامی قرار دے
دیا جائے-اسی طرح کی ایک کہانی حسن بن صباح کے
نام سے گھڑھی گئی-یہ کہانی بناتے ہوئے جنگ جمل
سے لیکر بعد میں پیش آنے والے سارے واقعات کو
حسن بن صباح کی تحریک کے سر ڈال دیا گیا اور
مکتب امام علی اور ان کی ذات کو بری طرح سے

مسخ کرنے کی کوشش ہوئی-میں اکثر سوچتا ہوں کہ
امام علی،عبد اللہ بن مسعود ،ابو زر غفاری ،سلمان
فارسی اور عبد اللہ بن عباس کیوں قران اور نزول قران
کی تاریخ کو اکٹھا رکھنے پر اصرار کرتے تھے اور
کیوں مکتب امام علی کے رہبروں نے تاریخ اسلام کو
محفوظ کرنے پر زور دیا ؟تو مجھے اس کی سمجھ اس
طرح سے آتی ہے کہ اگر تاریخ اور نزول قران کے
اسباب کو اکٹھا نہ رکھا جائے تو پھر قران کا کوئی
بھی مطلب بنایا جاسکتا تھا-اسی طرح سے تاریخ اسلام
کے سماجی پس منظر کو سمجھنے اور اس کی جنگ
جن طبقات سے ہوئی ان کو نکھار کر سامنے لانے میں
واحد مددگار کے طور پر موجود ہے-شائد یہی وجہ
ہے کہ جن لوگوں نے محنت کے ساتھ تاریخ اسلام
مرتب اور محفوظ کرنے کی کوشش کی ان کو غیر
معتبر اور ان کے صدق میں شک کا اظہار کر دیا گیا-
حیران کن امر یہ ہے کہ شہاب زہری ہو،صاحب تاریخ
طبری ہوں،صاحب تاریخ الکامل ابن اثیر ہوں.صاحب
تاریخ یعقوبی ہوں،صاحب تاریخی مروج الذھب ہوں-ان
سب کو جھوٹا کہنے کی کوشش کی گئی-انھوں نے
مکتب امام کے بارے میں جو درج کیا اس کو غلط
ثابت کرنے کی کوشش ہوئی-اور دیکھئے کہ ابن مخنف

اور کلبی جیسے راوی اس لئے جھوٹے کہہ دیے گئے کہ انھوں نے بنو امیہ کے جھوٹ کو کھولا اور مکتب امام کے رہبروں پر جو ظلم روا رکھے گئے ان کو بیباکی سے بیان کر دیا -قیس ہلالی کا رسالہ ایک مدت تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا اور یہ قیس ہلالی حضرت علی کے صحابی تھے -انھوں نے بعد از وفات نبی حضرت علی اور مکتب علی پر گزرنے والی ساری واردات کو بیان کر ڈالا-یہ کتاب آج بھی بہت محدود پیمانے پر سامنے آئی ہے-مکتب امام کے مخالف تو اس کتاب کا ذکر بھی نہیں کرتے ہیں-

سیدہ رباب ترمذی ابھی یہ بات کر رہی تھیں کہ قمبر عباس نے ہماری توجہ دکتور محمد حسین کے تھیسس "شہر کوفہ:جنم اور ابتدائی تاریخ "کی طرف دلائی -ان کا کہنا تھا کہ دکتور محمد حسین نے اپنے اس مقالے میں بہت اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے-دکتور محمد حسین کا کہنا ہے کہ کوفہ شہر ابتدائی زمانہ میں شیعہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں تھا-ان کے مطابق بھی کوفہ اس وقت شیعہ سرگرمیوں کا مرکز بنا جب اہل مصر ،اہل بصرہ اہل کوفہ کے ساتھ مل کر مدینہ آئے اور انھوں نے حضرت عثمان کی معزولی کا مطالبہ کیا اور اس دوران حضرت علی سے ان کا رابطہ ہوا-کوفہ

ایک چھاؤنی کے طور پر عمر نے بسایا تھا-اور اس
شہر میں سپاہیوں کی آبادی اس دور میں بھی واضح
طور پر قبائلی اور علاقائی بنیادوں پر کی گئی-دکتور
محمد حسین کہتے ہیں کہ فرات کے مغربی کنارے پر
شمالی عرب کو بسایا گیا -جبکہ فرات کے مشرقی
کنارے پر جنوبی عرب کے لوگوں کو بسایا گیا-شمالی
عرب کے لوگ حجاز اور بدوی علاقوں سے تھے-
جبکہ جنوبی عرب کے لوگ زیادہ تر یمنی لوگ تھے-
ابتدا میں ان میں فارسی بولنے والے چار ہزار لوگ
بھی تھے-یہ جو جنوبی عرب کے لوگ تھے اور
فارسی لوگ تھے ان کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ یہ
دوسرے کے شہری بنا کر رکھے گئے تھے-ان کو
عمر کے دور میں بیت مال سے وظیفہ کا جو معیار
رکھا گیا اس میں بھی امتیازی سلوک رکھا گیا-جو لوگ
ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے ان میں اور جو بعد میں
ہوئے کے درمیان فرق رکھا گیا-اسی طرح سے ہجرت
کرنے والوں میں سے جو کم عمر ہے اور نبی کے
ساتھ جنگ نہیں لڑ سکا تو اس کا وظیفہ جنگ لڑنے
والوں سے کم رکھا گیا-اگر آپ عمر ،عثمان اور معاویہ
کے ادوار کو دیکھیں تو کوفہ کے اندر ان ادوار میں
گورنرز کے خلاف وقفے وقفے سے تحریکیں چلیں-

اور ان کے احکامات ماننے سے انکار ہوا-امام علی
اور مکتب امام علی کے پھیلاؤ میں ان انتظامی شکلوں
کا بہت ہاتھ تھا جو نبی کی وفات کے بعد آنے والے
حاکموں نے حجاز سے باہر اختیار کیں-عمر نے کوفہ
کو چار انتظامی یونٹس میں تقسیم کیا-اور اس کی بنیاد
قبائلی رکھی-اور اس زمانے میں طاقت اور اقتدار ان
لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو خود کو نبی کا ساتھی کہتے
تھے اور اس بنیاد پر حق حکمرانی چاہتے تھے-اس
اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے انھوں نے عرب قبیلوں
کی قبائلی ارستوکریسی کو جونیر شراکتدار کے دور پر
ساتھ ملایا-اب جو جنوبی عرب کے لوگ تھے یا
فارسی وہ ابتدا میں ان کے ساتھ ملے تھے-یہ جو دو
پاور فل طبقات تھے یعنی اصحاب اور قبائلی
ارستوکریسی ان کے درمیان طاقت کی نسبت عثمان
کے دور میں الٹ ہوگئی-مطلب اصحاب کی اکثریت
جونیر پارٹنر ہوگئی اور قبائلی ارستوکریت اول اور
سینئیر پارٹنر ہوگئے-عثمان کے زمانے میں جنوبی
عرب کے جو چند مذہبی طور پر بہت بااثر لوگ خیال
کئے جاتے تھے ان کو ہٹا کر اموی خاندان کے لوگ یا
دوست لگا دیے گئے-انیس سالوں میں جو نظام عمر کی
وجہ سے چلا اس کے نتائج سامنے آنا شروع ہوگئے-

عرب ارستوکریسی کے غلبے کے خلاف قبائلی اور
شہری حلقوں کی بغاوت نے جنم لیا-اس کے نتیجہ میں
عثمان کا قتل ہوا-امام علی نے جب ان کو خلفہ چنا گیا
تو ایک طرف تو انھوں نے اپنا کیپٹل کوفہ منتقل کر
دیا-دوسرا انھوں نے عمر کے سات قبائلی یونٹس کے
نظام کو اس طرح سے بدلا کے عرب قبائلی
ارستوکرسی اور اموی اشراف کی طاقت بھی ختم ہونے
لگی-علی نے مذہبی بااثر لوگوں کو بحال کیا-یہ لوگ
اپنی آخری سانس تک امام علی کے ساتھ رہے-مالک
بن اشتر،مصیب بن نخبہ،عدی بن حاتم اور حجر
الکندی-امام علی نے ٹرائب اور کلان کے ناجایز اثر
کو ختم کرنے کی کوشش کی-امام علی نے جو بھی
کوشش کی اس سے اشراف کو سخت نقصان پہنچ رہا
تھا-مکہ اور بصرہ کے اشراف نے ایک اتحاد بنایا جس
کو حضرت علی نے جمل میں شکست دی-جنگ صفین
کے اندر قبائلی سرداروں اور اشرافیہ نے یہ کیا کہ
انھوں نے امام علی کی فتح کو روکا اور وہ معاویہ کو
بھی جیتتا نہیں دیکھ سکتے تھے-انھوں نے اس ایشو
کے لئے ہی پہلے تحکیم کرائی اور پھر تعطل پیدا کیا
تاکہ کوئی فیصلہ نہ ہو اور وہ اپنا اپنا کھویا اثر رسوخ
بحال کروالیں-خارجیت کا ظہور اسی تناظر میں ہوا

تھا-ہم نے یہ بھی دیکھا کہ امام علی کے بعد جب
معاویہ کے پاس کوفہ کا کنٹرول آیا تو اس نے امام علی
کے انتظامی بلاک کو پھر سے ختم کیا اور اموی
اشراف اور ٹرائبل ارستوکریسی کو پھر سے غالب کر
دیا-امام علی کے مکتب نے نو مسلم اور عجمی
شہریوں کو دوسرے درجے کا شہری قرار دینے سے
انکار کیا تھا اور ان کو برابر کا درجہ دیا تھا-بیت مال
سے وظیفہ کی تقسیم میں معاشی ضرورت اور احتیاج
کو اصول قرار دے دیا گیا تھا -اسی وجہ سے مکتب
امام علی بہت تیزی کے ساتھ کوفہ اور اس کے گرد و
نواح میں پھیل گیا تھا-امام نے جس طرح حجازی امراء
اور قبائلی ارستوکریسی کے خلاف جدوجہد جاری
رکھی تھی اور غیر منصفانہ طرز حکومت کے خلاف
اپنی جدوجہد کو عملی طور پر ثابت کیا تھا -اسی
رستے پر مکتب امام علی کے دوسرے آنے والے آئمہ
اور رہبر چلتے رہے-یہی وجہ ہے کہ کوفہ سے ملحقہ
علاقوں جن میں آزربائیجان بھی شامل تھا میں قزلباش
جیسے قبیلوں کی حمایت بھی مکتب امام علی کو
حاصل ہوئی-مکتب امام علی وہ مکتب تھا جس نے
میسوپوٹومیہ اور نیل کی تہذیبوں کے صحت مند
کلچرل عناصر کو قبول کیا-یہاں تک کہ مکتب علی نے

غیر عرب ایتھنک اور دیگر شناختوں کو بھی اپنے
اندر جذب کیا-اموی حکمرانی نے جس طرح عرب
اشارافیت کو مسلط کرنے کی کوشش کی تھی اس کی
راہ میں اگر مزاحمت کسی مکتب نے دکھائی تو وہ
مکتب علی ہی تھا-مکتب علی نے اسلام کو عربی مذہب
بننے سے بچایا-اور اس کو ایک ایتھنک مذہب بننے
سے بھی بچایا-مکتب امام علی کی صفت یہ رہی کہ
اس نے ہر سماج کے اندر سب سے نچلی سطح کی
پرتوں اور طبقات کو بھی اپنے اندر سمو لیا-برصغیر
پاک و ہند میں مکتب امام علی اسی لئے بہت زیادہ
مقبول ہوا-اور اس مکتب کے اثرات صرف امامیہ تک
محدود نہیں رہے بلکہ اس کے بہت گہرے اثرات ہمیں
اہل تصوف اور اہل سنت کے غیر سلفی مکاتب فکر
کے ماننے والوں پر بھی نظر آتے ہیں-مکتب علی کی
رمزیت اور بھید بھری کی نشانیاں آج عراق سے لیکر
ایران اور پھر برصغیر پاک و ہند تک ہمیں جابجا نظر
آتی ہیں-سندھو وادی کو مکتب علی کی ثقافتی لہر نے
بہت زیادہ فیض یاب کیا ہے-یہاں مزارات اور دیگر
مقدس مقامات سے ایک گہرا ثقافتی عمل جنم پذیر ہوا
ہے-جس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے-لوگوں کی
نفسیات اور شعور پر امام علی اور ان کے مکتب کے

گہرے اثرات موجود ہیں-اور یہ کلچر میں اپنا اظہار خوب کرتے ہیں-

کلام امام علی اور رمزیت

تاریخ کے موضوع پر اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا تھا-کہ اتنے میں ابن حسن نقوی نے کہا کہ ہمیں خود امام کے اپنے کلام کو بھی زیر بحث لانا چاہیے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ امام علی کے کلام میں رمزیت کا جو عنصر ہے اور معنی کی جو تہہ داری ہے وہ سامنے آسکے-ابن حسن جو کہ لبنان سے بیروت یونیورسٹی سے پڑھے ہوئے ہیں-اور مسلم فلسفہ پر گہری نظر رکھتے ہیں-نہج البلاغہ کا نسخہ لئے ہوئے تھے کہنے لگے کہ ہمیں خطبہ شقشیہ سے آغاز کرنا چاہیے
اما واللہ لقد تقسہا ابن قحافہ ...."خدا کی قسم" ابن قحافہ نے خلافت کی قمیص کو زبردستی پہن لیا تھا ""حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں خلافت کے لئے اتنا ہی ناگزیر ہوں جتنا چکی کے لئے کھونٹا ہوا کرتا ہے،جس پر اس کی گردش کا انحصار ہوا کرتا ہے-علوم و معارف میرے چشمہ فیض سے آبشار کی طرح گرتے ہیں اور علم و دانش کی فضاء میں کوئی میری طرح پرواز نہیں کرسکتا -اس کے باوجود میں نے خلافت سے منہ پھیر لیا اور چشم پوشی کرنے لگا

کیونکہ میں نے سوچا کہ کسی مدد گار اور ہمدرد کے
بغیر کیا خلافت کا مطالبہ ٹھیک ہوگا-اور کیا یہ بہتر
نہیں ہے کہ تاریک رات کی مصیبت میں صبر سے کام
لیا جائے جو جوانوں کو بوڑھا اور نڈھال کئے دیتی
ہے-میں نے دیکھا کہ صبر کرنا ہی عقل مندی ہے-
صبر کیسا کہ جس میں آنکھ خاک اور غبار سے اور
حلق اور گلہ اور ہڈیاں غم و اندوہ سے سخت تکلیف
میں مبتلا تھیں-میں اپنی میراث کو تاراج ہوتے دیکھتا
رہا "

اب ذرا یہاں پر علی دوران گفتگو ہی ایک شعر پڑھ کر
بہت لطیف انداز میں دور نبی اور بعد از وفات نبی کا
فرق بھی بیان کرتے ہیں-

شتان ما یومی علیٰ کورھا----ویوم حیان اخی جابر
آج میں اونٹ کی کوہان و پالان پر بیٹھا ہوں اور رنج و
سختی میں گرفتار ہوں-اور کہاں وہ دن تھے کہ اپنے
بھائی جابر کے پاس خوش و خرم تھا-

اسی خطبہ میں علی بعد از وفات نبی نظام کی خرابی
کو دو جملوں میں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ
ساری حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے-

دونوں ناقہ خلافت کے تھن درشتی سے دوہ لئے-ناقہ"
خلافت کو سخت ناہموار زمین پر ڈال دیا-جہاں اس کے

تھنوں سے زخم رسنے لگے اور اس کو ہاتھ لگانا
دشوار ہوگیا-لغرزشیں بہت ہوگئیں-طرح طرح کے عذر
تراشے گئے-ناقہ خلافت کا سوار اگر اس کی مہار
کھینچے تو بینی زخمی ہو اور اگر ڈھیل دے تو خود
ہلاک ہوجائے"اسی خطبہ میں امام علی بتاتے ہیں کہ
انھوں نے کیوں خلافت قبول کی-استعارہ اور تشبیہ
،رمز کنایہ ،مجاز سب کا استعمال اس خطبہ میں عروج
پر ہے-امام علی نہج البلاغہ میں جہاں بھی ان امور کا
ذکر آیا جو حساس بھی تھے اور بہت نازک بھی -وہاں
پر امام نے بہت لطافت کے ساتھ ما فی الضمیر بیان کیا
ہے-تاریخ کے وہ سارے کردار جو امام علی اور مکتب
امام علی کے سامنے کھڑے ہوئے -ان کے بارے میں
امام نے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا وہ بہت زیادہ
تہہ دار اور پرت در پرت معنی رکھتا ہے-ان کی گفتگو
میں کہیں ابتذال تو دور کی بات ہے سطحی پن بھی
نہیں آتا-اور کسی بھی جگہ ان کے کلام میں دشمنی
،کینہ،بغض کی فضاء نہیں بنتی-نہج البلاغہ میں کلام
علی کی فضاء بوجھل ،افسردہ اور رنج و غم سے بنی
ہوئی تو ہے مگر یہ فضاء کینہ پروری یا سطحی پن
کی فضاء نہیں ہے-عقل و منطق ،استدلال کہیں بھی
رخصت نہیں ہوتے اور امام علی انتہائی جذباتی فضاء

میں بھی معقولیت کی صفت کو خود سے الگ نہیں
کرتے-اس فضاء کو پینٹ کیا جائے تو سوگواری کے
رنگوں کے ساتھ ساتھ عقل و منطق اور استدلال کے
رنگ بھی ساتھ دکھانے ہوں گے-اب سوگواری اور
تعقل پسندی کے درمیان کنٹراسٹ دکھانا ہی مصور کا
-کمال ہوگا اور اس کے فن کا امتحان بھی
امام کی زندگی کے آخری لمحات بھی ان کی تعقل
پسندی کو ان سے الگ نہ کرسکے اور ان کو اس
موقعہ پر خیال آیا کہ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب
"ہوگیا
صبح ہوچکی تھی-ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ بارگاہ باب
شہر علم میں حاضری میں کب رات کی تاریکی
رخصت ہوئی اور صبح کی روشنی پھیل گئی-بہت
ساری باتوں کی تفصیل میں درج نہیں کرسکا -کیونکہ
-پھر یہ مضمون بہت طویل ہوجاتا
امام علی اور ان کا نظریہ توحید
یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھے شیخ ابن عربی کے
نظریہ وحدت الوجود اور نظریہ توحید پر ایک تھیسس
لکھنا تھا-اور اس تھیسس کے لئے مجھے مسلم فلسفہ
میں توحید کی حوالے سے اول سے لیکر آخر تک
توحید کے حوالے سے مسلم فکر کے ارتقاء کی تاریخ

کو دیکھنا پڑا-یہ بہت دلچسپ کہانی بنتی ہے-میں نے
انہی دنوں نہ صرف شیعہ اور بریلوی مولوی حضرت
سے رابطے کئے-بلکہ دیوبندی اور وہابی حضرات
سے بھی رابطے ہوئے-اور ان روابط کے دوران جہاں
مسلم تاریخ کے اولین ماخذ کے بارے میں بہت ساری
آگاہی ملی -وہیں پر مجھے عقیدہ توحید کے حوالے
-سے ہونے والے معرکوں کے بارے میں بھی پتہ چلا
مسلم تاریخ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بنتا ہے کہ یہاں جو
توحید کے حوالے سے بحث شروع ہوئی -اس کا پس
منظر سیاسی تھا-اور یہ سیاسی جدوجہد تھی جس کے
دوران عقیدہ توحید میں بھی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی
رہیں-خلافت اور اس کے پہلو سے نکلنے والی ملوکیت
نے توحید کو جس طرح سے شکل دینے کی کوشش
کی -اس کو اگر ہم تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ بات
سمجھ میں آتی ہے کہ سرکاری اور درباری مولویوں
اور مفتیوں کو کیوں یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی
کہ وہ توحید میں اس کی ذات کو اس کی صفات سے
الگ کر کے ایک دوئی کی کیفیت پیدا کر دیں-یہ جو
ذات الہی کی تقسیم کی کوشش تھی -اسی کی وجہ سے
بنوامیہ اور بنو عباس اپنے پنی ملوکیت کو قائم اور دائم
رکھ سکتے تھے-اور اسی کے بل بوتے پر وہ یہ کہ

سکتے تھے کہ توحید اور عدل کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں بنتا ہے-جب آپ ذات اور صفات دونوں کو قدیم مان لیتے ہیں تو ایک طرف تو فکری طور پر ایسی پیچدگی کا آغاز ہوتا ہے کہ آپ اس سے نکلنا بھی چاہئیں تو نہیں نکل سکتے -کی وجود ایکٹو واجب الوجود ثابت ہوتے ہیں-واجب الوجود کا مطلوب یہ کہ ایسا وجود جو اپنے ہونےمیں کسی اور کا محتاج نہ ہو- پھر یہ کثیر وجود کئی ازلی اور قدیمی وجودوں کو ماننے پر آکر رکتے ہیں-اور پھر یہ سلسہ چلتے چلتے واجب الوجود ذات کو حادث ،ممکن وجود میں لے آتا ہے-یہ وہ مشکلات ہیں جن سے سرکاری اور درباری مولویوں اور مفتیوں سے نظریہ توحید کو اخذ کرنے والے ہمیشہ دوچار رہے-اور یہ نظریہ توحید ظالموں اور قبضہ گیروں کو جواز حکمرانی بھی فراہم کرتا رہا ہے

میں یہ ساری تفصیلات جان کر حیرانی کے سمندر میں غرق رہا-مابعد الطبیعات سے مجھے اس قدر کبھی لگاؤ نہیں رہا تھا-اور میں جو جدلیاتی مادیت کا سچا پیرو کار ہوں -کبھی مذہبی موشگافیوں میں مبتلا بھی نہیں رہا-لکین ایک علمی تحقیق کے دوران جب اس معاملے کو دیکھنا پڑا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا

تاریخی مادیتی شعور میرے کتنے کام آیا -کہ میں ان
نظریات کے جدال کے پیچھے کارفرما ٹھوس مادی
حالت کا بھی ادرک کرنے کے قابل ہوگیا-اگر کبھی
موقعہ ملا تو توحیدی نظریات کے پیچھے کارفرما
تاریخی مادی حالات بارے بھی تفصیل سے لکھوں گا-
سردست میرا مقصد امام علی کے نظریہ توحید کے
بارے میں بات کرنا ہے-اور یہ میں اس لیکرنے جا رہا
ہوں کہ کل رات امام بارگاہ میں مجلس پڑھتے ہوئے
ایک عالم نے ذات خداوندی پر بات کرتے ہوئے خدا
کی ذات کے مظہر ہونے کی ایک دلیل پر گفتگو کی تو
مجھے وہ عالم امام علی کے نظریہ توحید سے کون
دور نظر آئے-اور اسی غلطی کے مرتکب ہوئے جس
سے بچانے کے لئے امام علی نے بہت مرتبہ توحید پر
کلام کیا-یہ کلام بہت اہمیت کا حامل ہے-اور اس کلام
کے مواد کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھ آتا ہے کہ امام
کس قدر اس بات سے آگاہ تھے کہ تشبیہ اور مثل دو
ایسی بیماریاں ہیں جو اگر توحید میں داخل ہوجائیں تو
پھر توحید توحید نہیں رہتی بلکہ دوئی میں بدل جاتی
ہے-مجھے امام علی کے کلام میں یہ پہلو اس وقت
نظر آیا جب میں نہج البلاغہ میں امام کے اقوال توحید
پر تلاش کر رہا تھا-اب یہ عجیب اتفاق تھا کہ امام علی

کا پہلا خطبہ جو آفرینش کے بارے میں ہے -اس کا
آغاز ہی اسی نظریہ توحید کے بیان سے ہوتا تھا-اور
شائد یہ امام علی کا پوری نہج البلاغہ میں سب سے
زیادہ تفصیلی خطبہ ہے-عقیدہ توحید پر-اور یہ وہ
خطبہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ بات سمجھ
میں آئی کہ کیوں ابن عربی جیسا عالم صفات کے عین
ذات ہونے پر اصرار کرتا تھا-اور معتزلہ کیوں توحید
میں تنزیہ کو ضروری قرار دیتے تھے-اور تشبیہ کی
مخالفت میں کمر بستہ تھے-اور کیوں فخر الدین رازی
پر سوال نقد اور جواب ادھار دینے کا الزام لگا تھا-اور
یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں بنو امیہ اور بنو
عباس کے بادشاہوں کے درباری مولوی آخر میں
عقل ،استدلال ،منطق،فلسفہ ہی کے دشمن ہو گئے
تھے-اور پھر بغداد اور غرناطہ میں کتب ہائے علمی
کو جلایا کیوں جانے لگا تھا-اگر ہم مسلم دنیا میں زوال
علمی اور فلسفیانہ علوم اور سماجی علوم سے نفرت
اور حقارت والے رویہ کے پھلنے اور پھولنے کا
جائزہ لیں تو ہمیں اس کی وجہ بھی یہی سرکاری
-نظریہ توحید نظرآئے گا

تو امام علی کا یہ اول خطبہ بہت اہم ہے-میں مجلس سن
کر گھر آیا تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ میں نے

اپنے نوٹس والی پرانی کاپی نکالی اور بیروت سے
چھپی نہج البلاغہ سامنے رکھی -جس پر ایک عربی
اور ایک فارسی تشریح کے حاشیہ موجود ہیں-تو
مجھے احساس ہوا کہ میرا خیال ٹھیک تھا-میرے نوٹس
میں عنوان لکھا ہوا ہے "حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا
" نظریہ توحید
-یہاں میں نوٹس کو جوں کا توں درج کر رہا ہوں
نہج البلاغہ کا خطبہ اول میں ایک جگہ لکھا ہے
وہ ذات جس کا ادرک بلند ہمت والے بھی نہیں
-کر سکتے
پھر اسی خطبہ میں مولا کا یہ فرمان درج ہے
دین کی اول (بنیاد)اس کی (ذات خدا)کی معرفت ہے
اور اس کی معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے
اس کی تصدیق کا کمال اس کی توحید ہے
اور کمال توحید اس کے لئے اخلاص ہے
اور کمال اخلاص اس کی ذات سے صفات کی نفی ہے
اور یہ گواہی دینا ہے کہ ہر صفت اپنے موصوف کی
غیر
-ہوتی ہے
یہ بھی گواہی دینا ہے کہ موصوف بھی اپنی صفت کا
غیر ہوتا ہے

تو جو بھی صفت کو موصوف سے ملاتا ہے -وہ دوئی
کا مرتکب
ہوتا ہے-
اور جو دوئی کا مرتکب ہوتا ہے -وہ ذات کی تقسیم کا
مرتکب ہوتا ہے
اور جو ذات کو تقسیم کرے -ووھیس ذات سے بےخبر
ہوتا ہے
اور یہ ذات سے بے خبری ہے کہ اس کی سمت اشارہ
ہوتا ہے
نوٹ :امام علی نے یہاں بتایا ہے کہ صفات کو اگر
تسلیم کر لیا تویہ ذات خدا کو تقسیم کرنے کا عمل ہوگا-
اور اسی کے نتجہ میں خدا کے لئے کسی مکان اور
جہت کا ماننا لازم آئے گا-اور پھر خدا اور بندے میں
کوئی فرق نہیں رہے گا-
جو اس کی طرف اشارہ کرے -وہ اس کی حد مقرر
کرے
جو حد مقرر کرے تو گویا اس کو قابل شمار خیال
کرے
اور جس نے خدا کے مکان بارے سوال کیا
اس نے اسے مکان کے ساتھ ملا دیا

جس نے اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس چیز پر ہے
-اس نے دوسرے مقام کو اس سے خالی خیال کر لیا
نوٹ :امام علی کا یہ بیان اس کی ذات کے مطلق واحد ہونیور اس کی ذات کے مجرد واحد ہونیکے بارے میں ہے-اور جب کوئی مطلق ومجرد واحد ہو تو پھر اس کی تقسیم کا کوئی شبہ نہیرھتا-امام علی کا کہنا یہ ہے کہ خدا کی زاٹکی وحدت تجرید اور مطلق وحدت پر ہے-اسی وجہ سووہ صفت کو اس کی ذات سے الگ یا اس کی ذات پر زائد ہونے سے انکار کو کمال توحید قرار دیتے ہیں-اور ان کے نزدیک تبھی تو ذات کی وحدت برقرار رہتی ہے-اسی لئے وہ مرکب وحدت کا انکار کرتے ہیں-کیونکہ جو مرکب ہو -وہ ترکیب میں آتا ہی اجزاء سے ہے اور جو اجزاء سے مرکب ہواہو وہ تقسیم و تحلیل بھی ہو سکتا ہے-اور جو تحلیل و تقسیم ہو جائے یاس کا امکان پیدا ہو جائے وہ ذات پھر خدا کی ذات تو تو نہیں رہ پاتی-مولا علی کی یہ توجیح مجھے سورہ اخلاص سے اخذ کی ہوئی لگتی ہے-
کیونکہ سورہ اخلاص ووہسورۂ ہے جو مکمل تجرید اور تنزیہ کی کامل و اکمل مثال ہے-جس میں احد،صمد اور پھر اس کے احد ہونے اور اس کی احدیت میں

کسی کے شریک نہ ہونے کا بھی ذکر موجود ہے-اور
قران ہی میں ایک جگہ یہ موجود ہے کہ
-کوئی شے بھی اس کے مثل نہیں ہے
اور ایک جگہ یوں ہے
آنکھیں اس کا ادرک نہیں کرتیں -مگر وہ تمام کی
بصریتوں
-کا ادرک کرتا ہے
کیونکہ ادرک کو جتنا چاہئیں پھیلائیے -اس کی ذات کا
احاطہ ممکن نہیں ہے-کیونکہ کے ممکن کا ادرک بھی
ممکن اور اس کی کوئی ابتدا ،درمیان اور آخر ہوا کرتا
ہے-اور یہ ابتدا،درمیان اور آخر تو احدیت کے منافی
ہیں-جو وجود ممکن ہے -وہ حادث بھی ہے-اور اپنے
ہونے کے لیےکسی کا محتاج بھی-اور جو جوہر ہے وہ
بھی چار جہتوں اور وقت کے ساتھ بندھے ہونے کی
وجہ سے ممکن ہی ہوتا ہے-اور جو عرض ہو وہ
بھمختالیف کیفیتوں کی وجہ سے ممکن اور بقا سے
خالی ہوتا ہے-تو خدا عاملی کہاں اپنی ذات کے اعتبار
سے واحد بھی ہے-اور اپنے وجود کے اعتبار سے
بھی وہ واحد ہے-اور اسی لئے واجب الوجود ہے-
مطلب وہ اپنے ہونے کے لئے کسی اور چیز کا محتاج
نہیں ہے-اور اسی وجہ سے اس کی صفات کو اس کی

ذات کا عین کہا گیا ہے-یہ اس کی ذات پرکسی قسم کا اضافہ نہیں ہیں-نہ ہی اس پر کوئی زائدہ قسم کی چیز ہیں-

یہ ہیں وہ نوٹس جو میں نے پہلے خطبہ کے بارے میں لئے تھے-میں نے عربی اور فارسی عبارت کو حذف کر دیا -کیونکہ مطلب اور ثقیل ہوجاتا-تجرید اور اخلاص کا توحید میں جو پیمانہ امام علی نے اپنے خطبہ میں بیان کیا -وہ مجھے کل رات نظر نہیں آیا-بلکہ تشبیہ اور ذات کی تقسیم کی طرف مائل عالم کا خطاب بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا-ایک اچھی بات یہ عالم اپنے سننے والوں سے کہ رہے تھے کہ انہیں اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہئے-کتب کو پڑھنا چاہئے-تاکہ کل کو وہ مجھے کہ سکیں صاحب آپ یہاں غلطی پر ہو-میرا دل چاہا تھا کہ میں اٹھ کےرسول کر دلوں -لکین میں نے ان کی کہی بات کو عقیدت سے سنا اور قبول کر لیا-اس کا تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی-ورنہ نتیجہ بہت برا نکلنا تھا-میں شائد اس وقتبیٹھا یہ نوٹ نہ لکھ رہاہوتا-

ہاں ایک اور بات یاد آئی -رات یہ عالم اپنے علم کو گلوبلائز کرنے کا کہ رہے تھے-اور اس کے لئے انٹرنیشنل مارکیٹ سے جڑنے کا کہ رہے تھے-منڈی

اور وہ بھی بین الاقوامی ....تو مجھے بے اختیار
خیال آیا کہ منڈی کی معشیت کا تو اصول رسد
اورسپلائی پر ہے-اور توحید کو اگر پروڈکٹ کے طور
پر دیکھاگیا تو اس کے ساتھ منافع کو بھی جوڑنا پڑے
گا-علی کی جو توحید ہے-وہ تو امراء،دولت مندوں
،طاقت وروں کے مقابلے میں کمزروں کی ہمنوا ہے-
منڈی کی معشیت میں تو یہ ویسے ہی ناکام ہو جائے
گی-یا پھر اس کا کردار تبدیل کرنا پڑے گا-جیسے
صفوی بادشاہوں نے کیا تھا-اور علی شریتی کو کہنا
پڑا تھا کہ صفوی شیعت کا سرخ شیعت سے کچھ لینا
دینا نہیں تھا-اور یہ علی کی شیعت نہیں ہے-ہمارے
ذاکروں اور مولویوں نے تو برصغیر میں اس کا کردار
عرصۂ دراز سے بدل رکھا ہے-یہ فیوڈلز ،سرمایہ
داروں ،نوابوں اور افسر شاہی کی خدمت کرنے والے
نظریہ کا روپ دھار چکی ہے-اور دیہی غریب تو اس
اشراف پنے کے ہاتھوں صدیوں سے استحصال کا
نشانہ بن رہے ہیں-

علی ،قران اور سیرت اور عمرانیات

علی کے مقام اور مرتبے کی جانچ کرنے اور ان سے
شناسائی حاصل کرنے کا ایک اور زریعہ ان کے فہم
قران اور فہم سیرت کو دیکھنا ہے-تاریخ ہمیں بتاتی ہے

کہ قران کی ترتیب کے بارے میں علی کا خیال تھا کہ اس کو آیات کے نزول کے مطابق اکٹھا کرنا چاہئے-ان کے خیال میں اس سے آنے والی نسلوں کے سامنے قران اور تاریخ اسلام کے درمیان باہمی ربط کی تلاش مشکل نہیں رہے گی-اس وجہ سے کوئی بھی قران اور اس کی غائت کے درمیان فاصلے پیدا نہیں کرسکے گا -اور اپنے مفادات کے تابع نہیں کرسکے گا

علی نے جب دیکھا کہ کوئی اس کام کا بیڑا اٹھانے کو تیار نہیں ہے تو انہوں نے یہ کام خود کرنے کی ٹھان لی اور انہوں نے خود قران کو ترتیب نزول کے مطابق ایک مصحف کی شکل میں اکٹھا کرلیا-تاریخ کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک گھر سے باہر نہیں نکلے جب تک -انہوں نے یہ کام مکمل نہ کرڈالا

علی کے بارے میں یہ روائت تاریخ سے ملتی ہے کہ انہوں نے یہ کام 17 رمضان کی رات سے شروع کیا جب قران کا نزول شروع ہوا تھا-حضرت علی ابن ابی طالب کی ایک اور روائت خدیجہ سے مروی ہے کہ ان کو خدیجہ نے بتایا تھا کہ جب محمد کی عمر 40 کے قریب ہوئی تو ان کی جانب سے خلوت پسندی کے مظاہرے زیادہ ہونے لگے اور ان کا زیادہ وقت غار حرا میں گزرنے لگا-اور اسی دوران پہلی وحی نازل

ہوئی-اس میں پہلی آیات کا نزول ہوا اور ان میں "علم
-"کی اہمیت کا بیان تھا
علی کی جانب سے علم و آگاہی اور دانش پر زور دیا
جاتا سب کے علم میں ہے اور اس کی جانب رغبت
-سے بھی ایک زمانہ واقف ہے
وحی کے نزول کی خبر سے سب سے پہلے خدیجہ
آگاہ ہوئیں،پھر یہ خبر ورقہ بن نوفل کو ملی اور اس
کے بعد ابی طالب کے گھرانے کو اور اس کے بعد
حضور نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اس کی
خبر دی-گویا علی کو آغاز سے ہی محمد اور قران کے
-ساتھ رہنے کا موقعہ میسر آگیا
محمد اور قران کے ساتھ کے ساتھ علی کی وابستگی
کئی اعتبار سے دوسرے اصحاب سے منفرد اور ممیز
تھی-علی کے بارے میں رسول کریم نے کئی مواقع پر
یہ کہا کہ وہ علم،بصیرت،تفقہ اور استنباط مسائل میں
سب سے آگے ہیں-یہی وجہ ہے کہ ان کی اس صفت کا
اعتراف خود اصحاب رسول نے بھی کیا-ان کی عمر
ان کے تدبر و تفقہ علمی کے آڑے کبھی نہیں آئی-ان
کی محمد اور قران سے وابستگی کی ایک انفرادیت یہ
بھی تھی کہ وہ اسلام کی تاریخ کے ایک ایک جزو
سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ احکامات قران و اقوال

رسول کے تاریخی سیاق و سباق سے بھی بخوبی شناسا تھے-ان کی اس انفرادیت کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ میں فرقہ پرستی اور زوال کی وجوہات کی تلاش کرتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے سب سے پرآشوب دور کا مطالعہ کرنے کی جانب بڑھتے ہیں-ایسے میں یہ علی کی زات اور فکر ہے جو ہماری مدد کرتی ہے اور ہمیں پورے سیاق و سباق کے ساتھ معاملات سے آگاہ کرتی چلی جاتی ہے-
میری اس تحریر میں توجہ اسی امر کی جانب ہے-اور اس کا آغاز ہم علی کی قران شناسی سے کرتے ہیں-اگرچہ میں اپنے ایک اور مضمون میں علی کے تصور توحید پر بحث کرچکا ہوں-مگر یہاں مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے کیسے قران شناسی کو سب سے زیادہ فروغ دیا اور فران شناسی میں کس طرح سے علی نے اس کے مابعدالطبعیات کو سماجیات و عمرانیات سے جوڑنے کی سعی کی-اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر قران کی مابعد الطبعیات کو دنیا کی عملداری کے ساتھ آپ نہیں جوڑکر دیکھتے تو پھر یہ بہت مشکل ہے کہ آپ غایت نزول قران کو سمجھ سکیں-

قران کے نزول اور محمد کی بعثت کے بارے میں علی
کرم اللہ وجہہ کے ارشادات،خطبات اور ان کے
مکتوبات میں ہمیں دو پہلوؤں پر بحث ملتی ہے-ایک
پہلو تو اس کے تاریخی سیاق و سباق سے معاملہ کرتا
ہے-جس میں علی مکّی،مدنی اور دیگر علاقوں کی بود
باش قبل اسلام بیان کرتے ہیں-ان کا اسلام بارے
ردعمل کی خبر دیتے ہیں-اور وہ یہ بھی واضح کرتے
ہیں کہ قریش مکّہ کا کیا حال تھا-وہ قران اور محمد کی
سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو بیان کرتے چلے جاتے
ہیں-اور علی اس تاریخی پس منظر میں ان لوگوں کی
حثیت بھی بے نقاب کرتے ہیں جو اسلامی معاشرے
کے اندر حاکمیت اور رعیت کو اپنے تابع بنانے کی
کوشش کررہے تھے-وہ ان کے غیر اسلامی افعال اور
ان کے ہوس طاقت و زر کو بھی بے نقاب کرتے ہیں-
اور اس طرح سے متنازعہ امور پر ایک راہ کا تعین
-کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں
علی اس کے ساتھ ساتھ قران اور سیرت محمدی کے
عمومی گوشوں کی وضاحت کرتے ہیں-اور ان کی
روشنی میں آفاقی اصولوں کو بیان کرتے ہیں-علی
فلسفیانہ جہت سے قران اور محمد کے تصور توحید کو
بیان کرتے ہوئے ذات باری تعالی کی تحریدی،غیر

تشبیہی ،غیر تجسیمی ،غیر ترکیبی حثیت کو بہت کھول
کر بیان کرتے ہیں-اور وہ اس حوالے سے خدا کی
احدیت کو برقرار رکھتے ہوئے انسان سے اس کے
تعلق کا بیان کرتے ہیں اور اس تناظر میں وہ جہاں
زات باری تعالی کے عدل سے وابستہ ہونے اور خود
انسان کی اپنی زندگی میں عدل کی اہمیت کو اجاگر
-کرتے ہیں
میں سوچتا ہوں کہ قران کا آغاز ان آیات سے ہوا تھا
پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو خون
-کی پھٹکی سے پیدا کیا
-پڑھئے بے شک آپ کا رب سب سے عزت والا ہے
-جس نے انسان کو قلم کے زریعے سے علم سکھایا
-انسان کو وہ سکھایا جس کو وہ جانتا نہ تھا
-جان لیں کہ انسان حد سے گذر جاتا ہے
-خود کو ہر شئے سے بے نیاز تصور کرتا ہے
بے شک ہر ایک نے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا
ہے
ان آیات میں علم،قلم اور تعلیم کے ساتھ انسان کے
رشتے اور پھر ان سب کے خدا کے ساتھ رشتے کی
وضاحت کی گئی ہے-اور میرے خیال میں علی علم و
آگاہی کی رسی کے زریعے سے اپنے رب کے ساتھ

رشتے میں جڑے تھے-اور ان کی یہ جڑت ہی ان کو
شہر علم کا باب قرار دلوانے میں مددگار ثابت ہوئی-
علم سے بصیرت جو حاصل ہوتی ہے وہ انسان کو
سجدہ کرکے رب کے قریب ہوجانے کی توفیق مرحمت
کرتی ہے-
علی بہت وضاحت کے ساتھ کئی جگھوں پر ہمیں
بتلاتے ہیں کہ جب وحی کی آمد اور اعلان نبوت ہوا تو
قریش جو حجاز کا سب سے طاقتور قبیلہ تھا نے اس
کو ماننے سے انکار کیا-ایسے میں چند لوگ تھے جو
محمد کی بات پر ایمان لائے-ان میں علی بھی تھے-
اہل مکّہ نے اپنے اندر سے نبی کی آمد اور قران کے
نزول کو ہی چیلنج کردیا-وہ اپنے شعور مذھبی و شعور
عمرانی جس کو قران نے جہالت اور گمراہی سے
تعبیر کیا کے آڑے آنے والے ہر خیال اور ہر تصور
کی مخالفت کی بلکہ اس کے خلاف دشمنی کی انتہا
کرڈالی-
اہل مکّہ نے اہل کتاب یہود و نصاری کو بھی اپنی
سماجی زندگی میں مداخلت کی اجازت نہ دی تھی-وہ
علم و حکمت بس وہ خیال کرتے تھے جو ان کے باپ
دادا سے چلی آرہی تھی-اس مخالفت میں قریش کے
سارے بڑے بڑے نام موجود تھے-اصل میں قریش کی

سماجی برتری،غلبے اور ان کے تفوق کی بنیادیں اس سماجی ڈھانچے کے اندر تھیں جو اس شعور مذہبی و عمرانی سے ملکر تشکیل بنا تھا جس کو قران نے جاہلیت سے تعبیر کیا تھا-قریش والوں کے سیاسی،سماجی اور معاشی مفادات نے ان کو محمد کی نبوت اور قران کی تعلیمات کا انکار کرنے پر مجبور کیا تھا-

علی قران اور سیرت محمدی سے ابھرنے والے نئے سماجی ،سیاسی اور معاشی ڈھانچے کی عدل،انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر استواری کو بپنے خطبات میں اکثر جگہ دیتے ہیں-اور انہوں نے اس پہلو پر زیادہ زور اس لیے دیا کہ قران ،محمد اور ان کے اصحاب کا نام لیکر ملاءالارض ناانصافی ،ظلم اور لوٹ مار کرنے لگے تھے-اور وہ مہاجر اصحاب رسول کا نام لیکر لوگوں کو فریب دینے پر تل گئے تھے-ایسے میں نہ صرف علی نے بلکہ بعد میں آنے والے آئمہ اہل بیت نے بھی قران اور احادیث کے شان نزول اور ان کی تاریخ کو بہت اہمیت دی-

میں ایک رات قران کا مطالعہ کررہا تھا اور ساتھ ہی کتب کا جن میں قول علی کا موجود ہونا لازمی ہوتا ہے کی ورق گردانی کررہا تھا-تو میرے سامنے سورہ

والضحی کھل گئی-اس سورۃ میں اللہ نےحضور علیہ
سلام کی یتیمی میں پرورش کرنے کے عمل کی توجیہ
کرتے ہوئے کہا کہ اصل میں عبدالمطلب،فاطمہ بنت
اسد اور ابی طالب کے ہاتھوں پرورش کا فعل فعل خدا
ہے-اسی طرح سے خدیجہ سے شادی اور محمد کی
معاشی خوش حالی کو اپنی مشیت قرار دیا-اور پھر
محمد علیہ سلام کو کہا جیسے ان کی مشکلات دور
ہوئیں،ایسے ہی ان کو بھی یتیموں،مساکین اور بے
کسوں کی مشکلات دور کرنی چاہئیے-اب آپ سیرت
محمدی دیکھیں وہ اسی طرح سے اہل بیت اطہار کو
بھی لوگوں کی مشکلات دور کرتے دیکھیں گے-علی
نے اس انفرادیت کو سماج کی اجتماعیت بنانے پر بھی
زور دیا-ان کے خیال میں جب تک اخوت،محبت ،جذبہ
خدمت جیسی اقدار کا احیاء نہیں ہوتا کمزروں کو
اٹھانے اور ان کی محرویوں کو دور کرنے کی کوشش
کامیاب نہیں ہوسکتی-

علی کہتے ہیں کہ رسول کریم اپنی آخری سانس تک
بے سہارا لوگوں کے ملجا و ماوی بنے رہے-انہوں نے
مکّہ اور مدینہ میں اپنی زندگی کے ہر پل میں ثابت کیا
کہ ان کو معاشرے کے مستضعفین کے ساتھ کس قدر
محبت اور انس ہے اور وہ ان کی خدمت کے لیے ہمہ

وقت تیار تھے-کیا یہ محض اتفاق ہے کہ محمد اپنے
مولا ہونے کا اعلان کرنے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ وہ
علی کے مولا ہونے کا زکر بھی کرتے ہیں-قران کہتا
ہے کہ
بے شک اللہ ،اس کا رسول اور مومنین سب تمہارے
-مولا ہیں
میں اس حوالے سے جب غور و فکر کی منزل سے
گزر رہا تھا تو مجھے علی کا ایک خط معاویہ کے نام
مل گیا-اس خط میں علی کی گفتگو سے مجھے اس آیت
کی بہترین تشریح کا اصول مل گیا-معاویہ نے علی کو
لکھا تھا کہ جہادفی سبیل اللہ کرنے میں اور شہیدوں
میں بنو ہاشم کے لوگوں کے ہونے میں کوئی امتیازی
بات نہیں ہے یہ تو اعزاز مہاجرین صحابہ کو بھی
حاصل تھا-اس پر علی نے معاویہ کو لکھا تھا کہ
بہت سے مہاجر اللہ کی راہ میں شہید ہوئے-ان میں ہر"
ایک کے لیے فضلیت ہے-لیکن جب حمزہ شہید ہوئے
تو محمد علیہ السلام نے ان کو "سید الشہداء"کا لقب دیا-
ان کی نماز جنازہ ستر تکبیروں کے ساتھ ہوئی-تم نے
نہیں دیکھا!کہ کتنے اصحاب کے جنگ کے دوران ہاتھ
کٹے تو ان سب کے لیے فضلیت ہے مگر جب یہ
معاملہ تبوک میں جعفر کے ساتھ پیش آیا تو محمد نے

ان کو طیار الجنۃ کا لقب مرحمت فرمایا-اور ان کو "ذوالجناحین کا لقب بھی دیا
علی اس خط میں آحر میں کہتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کے حکم کا پاس نہ ہوتا تو وہ اپنے باب میں بھی -فضائل کو بیان کرتے
میں نے یہ خط پڑھا تو سمجھ میں آگیا کہ جس طرح اللہ کے مولا ہونے کو دوسروں کے مولا ہونے کے مماثل خیال نہیں کیا جاسکتا،اسی طرح محمد اور علی کی مولائت کا قیاس عام مومنین کی مولائت پر نہیں کیا -جاسکتا
علی عکس قران تھے-عکس سیرت محمدی تھے اور علی عکس شعور و علم پیغمبر تھے-وہ جامع الصفات محمدی تھے اور پرتو سیرت محمدی تھے اور وہ تشریح قران تھے اور شہود قران تھے-اسی لیے محمد نے جہاں اللہ اور اپنے مولا ہونے کا اثبات کیا وہیں پر انہوں نے علی کے مولا ہونے کی گواہی بھی دی تھی- اور پھر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ گواہی نبی کریم نے اپنے اصحاب سے بھی لی تھی-اور ان کی گواہی پر اللہ کو گواہ بھی بنایا تھا-یہی وجہ ہے کہ علی کے پیرو نے جہاں اللہ کے الہ واحد ہونے کی گواہی دی اور اللہ

کا رسول محمد کے ہونے کی شہادت دی وہیں انہوں
-نے علی کے ولی ہونے کی گواہی بھی دی
محمد علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو اپنے آخری ایام
میں بار بار
یتیموں،مساکین،غرباء،محتاج،غلام،مسافروں اور
کمزوراقرباء کا خیال رکھنے اور ان کی محرومیوں کو
دور کرنے کی تلقین کی-اور ان سے غفلت کو ہلاکت
اور عذاب دوزخ کو دعوت دینے کے مترادف قرار دیا
تھا-خود کو تارک فیکم الثقلین سے تعبیر کیا تھا اور
مودت القربی کو اجر رسالت کے طور پر طلب کیا تھا-
آپ نے مدینہ کے اندر اعلان کیا تھا کہ "کوئی بھی
محتاج،مسکین،ضرورت مند ان کے نام سے قرض لے
سکتا ہے اور اس کو لوٹانے کی زمہ داری ان کی
ہے"گویا سماجی اونچ نیچ کے خلاف محمد نے عملی
طور پر جہاد کرکے دکھایا تھا-اور سماج میں بہار کے
-دائمی رہنے کی شرط اس کو ٹھہرایا تھا
محمد علیہ السلام کا فلسفہ یہ تھا کہ ایک اسلامی سماج
وہ ہے جہاں علم و معرفت کی روشنی
یتیمی،لاچاری،محتاجگی،غربت،ناانصافی اور ظلم کا ہر
-صورت خاتمہ کرے گی

علم و روشنی،معرفت حق اور ایمان کا شہود اگر سماج کے اندر یتیمی،محتاجگی،بے چارگی اور مفلسی کے خاتمے کی شکل میں نہیں ہوتا تو وہ سوائے منافقت کے اور کچھ نہیں ہے-یہ وہ وجدان تھا جو علی کو ودیعت ہوا تھا-اور علی نے اس وجدان کا اظہار اس وقت بھی کیا تھا جب عمر نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بیت المال کے وظائف اور مال غنیمت کی تقسیم فضیلت کی بنیاد پر ہوگی اور اس میں معاشی ضرورتوں کو اولیت حاصل نہیں ہوگی-اور ایک وقت آیا تھا جب تاریخ میں لکھا ہے کہ عمر راتوں کو اپنی داڑھی کے سفید بالوں کو پکڑ کر گریہ کرتے اور موت کی تمنا کرتے تھے اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر ان کی زندگی رہی تو امیروں کی دولت غریبوں میں بانٹ کر سب کو برابر کردوں گا-ابوبکر نے اس جوہر کو پہچانا تھا اور بیت المال میں مساوات کے اصول کو برقرار رکھا تھا-مگر عثمان کے دور میں یہ اصول نظر انداز ہوا اور معاویہ نے تو اس کو بالائے طاق ڈال دیا اور اسلام کے مغز کو نظر انداز کرکے چھلکوں کو اپنا مقصود قرار دے لیا تھا-اور یہ المیہ آج تک سارے مسلم معاشروں کا ہے کہ وہاں پر معرفت حق اور عدل و مساوات و انصاف کے درمیان نامیاتی رشتے کو نظر

انداز کردیا گیا ہے جبھی تو جہالت،گمراہی،ناانصافی اور کمزور طبقات کے ساتھ سب سے یادہ برا سلوک ان معاشروں میں ہوتا ہے-اور ان معاشروں میں قتل و غارت گری اور خون ریزی اس قدر زیادہ ہوگئی ہے -کہ فتنہ عظیم کا گمان ہوتا ہے

محمد علیہ السلام نے اسلامی تحریک کا جو آغاز کیا تھا اس میں خود غرضی اور بے حسی کا خاتمہ اور دردمندی کی ثقافت کے پھیلاؤ کا نصب العین بہت -اہمیت کا حامل تھا

محمد نے پورے مکّی سماج میں عدل و انصاف لانے کی ایک مہم شروع کی تھی-انہوں نے مکّہ کے اندر غیر فعال اور عضو معطل بنادئے جانے اور بیگار کی محنت کرنے والوں کو فعال اور ثمر حاصل کرنے والے بنانے کی طرف قدم بڑھایا تھا-حلف الفضول جیسا معاہدہ بھی سامنے آیا تھا-اس سارے عمل میں محمد کی رہنمائی وحی کررہی تھی-زرا سورہ انشراح کو پڑھئے-(میرے ساتھ عجب واقعہ ہوا کہ میں اس مقالہ کو لکھنے کی تیاری کررہا تھا کہ ایک رات سویا تو خواب میں بار بار یہ سورۃ دکھائی دیتی رہی-اور ایک آواز مجھے بار بار انشراح صدر نبی کریم بارے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتی رہی-میں فجر کے

وقت اٹھا تو جو خیالات فوری طور پر ذہن میں آئے ان
کو قلمبند کرلیا-جس نے اس مقالے کی تکمیل میں بہت
(مدد فراہم کی
علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول ملتا ہے کہ سورہ
انشراح سیرت محمدی کے بنیادی گوشے سامنے لیکر
آتی ہےکہ کیسے محمد علیہ السلام کا انشراح صدر ہوا
کہ جو راہ انہوں نے اختیار کی ہے وہ ٹھیک راہ ہے-
اور ان کو بتایا کہ ان کی ذاتی مشکلات کو جیسے اللہ
نے دور کیا ویسے ہی اس راہ کی مشکلات بھی دور
-ہوں گی-اور ہر مشکل کے بعد آسانی کی نوید دی گئی
لیکن علی کہتے ہیں کہ قریش کے سردار اور بنو امیہ
والے اس ساری پیش رفت کو ایک اور ہی نکتہ نظر
سے دیکھ رہے تھے-بنو امیہ کے اندر سب سے سے
زیادہ مالدار اور سیاسی و معاشی طاقت رکھنے والے
سردار تھے-یہ مکّہ کی تجارت پر غلبہ رکھتے تھے-
اور پھر ان کی بنو ہاشم سے سرد جنگ بھی موجود
تھی-بنو امیہ والے ایک بات تو طے تھی کہ اس
تحریک کو اپنے معاشی و سیاسی غلبے کے لیے
خطرات کے طور پر دیکھ رہے تھے-پھر حسد بھی
آڑے آرہا تھا کہ نبوت بنو ہاشم کے فرزند کے پاس
چلی گئی تھی-وہ اس کو قبائلی تنازعے کی شکل میں

دیکھ رہے تھے-وہ محمد کی ایک پیغمبر کے طور پر پیش قدمی دیکھنے کے وہ محمد کے اقدامات کو ایک ہاشمی زادے کے اقدامات کے طور پر دیکھ رہے تھے-وہ محمد کو اپنے بزرگوں کا باغی قرار دے رہے تھے-اور یہ سوچ فتح مکّہ کے وقت ختم نہیں ہوگئی بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے آگے سفر کیا-اور جب علی اسلام کی اصل شکل کا دفاع کرنے اور اسلام کی عملی افادیت کو غیر موثر بنانے کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے آگے بڑھے تو ان کی کاوش کو بھی قبائلی تعصب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش ہوئی-اور اس عمل میں تاریخ اور افکار کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی-

علی بنو امیہ کے رہنماؤں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں-اور ان کے فریب کا دامن بھی خوب چاک کرتے ہیں-علی اسلام کی تاریخ کے ارتقاء کی کہانی کو بیان کرنے کا زمہ اپنے سر لیتے ہیں-وہ صدق دل سے خیال کرتے تھے کہ اقامت حق اور دفع باطل کے لیے ان کی زمہ داری بنتی ہے کہ لوگوں کی رہنمائی کریں-

علی واشگاف انداز میں بیان کرتے جاتے ہیں کہ وہ اقتدار،حکومت،امارت کے کبھی خواہش مند نہیں رہے-
علی ایک جگہ شہداء اہل بیت کا زکر کرتے ہیں
"رسول کا طریقہ تھا کہ جب جنگ شدت اختیار کرتی اور لوگوں کے قدم اکھڑنے لگتے تو وہ اپنے اہل بیت کو آگے کردیتے تھے-اور مومنین کو تلواروں اور نیزوں کی آنچ سے بچاتے تھے-(دیکھا کہ جنگ کی آگ میں دوسروں سے پہلے اپنوں کی قربانی دینے کا اصول محمد علیہ السلام نے وضع کیا تھا)بدر کے دن عبیدہ بن حارث،احد کے دن حمزہ،جنگ موتہ میں جعفر شہید ہوئے تھے-اگر میرا دل چاہے تو میں بھی اپنا نام دوں-جس نے ان جنگوں میں شہادت کی تمنا اسی طرح کی تھی جس طرح اور اہل بیت نے کی تھی-لیکن ان کی موتوں نے ان کو جلدی آلیااور میری قضاء ابھی نہیں آئی"
علی کا معاویہ کو یہ ایک اور خط ہے جس میں علی اس کو اور دوسرے ان لوگوں کو واشگاف انداز میں بتلاتے ہیں کہ ان کا مقصد کبھی بھی امارت و حکومت اور صلہ نہیں رہا بلکہ ہ تو اپنے رب کی رضا اور شوق شہادت میں سب کام کرتے رہے ہیں-

علی مقام ذی قار میں موجود ہیں-جنگ بصرہ ہونے
والی ہے-اور وہ اپنے خیمے میں اپنے جوتے کی
مرمت کررہے ہیں-کہ عبداللہ بن عباس داخل ہوتے ہیں-
علی یونہی اچانک ابن عباس سے سوال کرتے ہیں
ماقیمۃ ھذا النعل
اس جوتے کی قیمت کیا ہوگی؟
ابن عباس نے کہا
لاقیمۃ لھا
-اس کی کوئی قیمت نہیں ہے
یہ سنکر آپ نے فرمایا
واللہ لھی احب الی من امرتکم الّا ان اقیم حقا او ادفع
باطلا
خدا کی قسم میں اس جوتے کو تمہارے پر امارت
کرنے سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں مگر یہ اقامت حق یا
-باطل کو بھگانے کے لیے کررہا ہوں
علی نے ایسی بات پہلی مرتبہ نہیں کی تھی-وفات
رسول کے بعد کئی موقعے آئے جب انہوں نے اس کا
برملا اظہار کیا-حضور علیہ السلام کے چچا حضرت
عباس نے جب ثقیفہ میں اصحاب رسول کے اجتماع کا
سنا تو علی سے کہا کہ وہ بھی وہاں جائیں-لیکن علی
نے جنازہ رسول کو چھوڑکر وہاں جانے سے انکار

کیا-اور جب ابوبکر ای بیعت کی خبر مدینہ پہنچی تو
ابو سفیان نے علی کو کہا کہ ہاتھ آگے بڑھائیں وہ مدینہ
کی گلیاں ان کے حامیوں سے بھر دیں گے-تو علی نے
اس موقعہ پر بھی اقتدار اور حکومت سے اپنی بیزاری
کا اظہار کیا-وہ شوری میں گئے اور وہاں جانے کا
مقصد انہوں نے یہ بیان کیا کہ وہ اتمام حجت کے لیے
وہاں جارہے ہیں-اور جب عثمان خلیفہ بن گئے تو یہ
علی تھے جنہوں نے سب سے زیادہ عثمان کی خیر
خواہی کا ثبوت دیا-وہ موقعہ شناس نہیں تھے-عثمان
کے خلاف سورش کو بہت سے لوگ تھے جنہوں نے
اپنی خلافت کے لیے اس کو نادر موقع سمجھا تھا-
خوب آگ بھڑکائی تھی-اور فتنہ کو جگایا تھا-علی نے
اہل کوفہ کے نام جو خط عمار یاسر اور امام حسن کے
ہاتھ بھیجا تھا اس کا متن پڑھنے کے قابل ہے علی
کہتے ہیں

یہ خط اللہ کے بندے علی کا اہل کوفہ کے نام ہے-"
جوکہ مدد میں پیش پیش اور عربوں کے سرخیل ہیں-
میں آپ کو عثمان کے بارے میں سارے معاملے کی
خبر ایسے بیان کرتا ہوں کہ گویا یہ سب آپ کے
-سامنے ہوا

لوگوں میں سے اکثر ایسے تھے جو عثمان پر طعنہ
زنی کرتے تھے-لیکن میں مہاجرین میں سے ایسا آدمی
تھا جو ان کی رضامندی زیادہ چاہتا تھا-اور کم سے کم
شکوہ کرتا تھا-طلحہ و زبیر ان کے ساتھ کبھی سرپٹ
دوڑتے تھے-اور ہلکے ہلکے آگ بن جاتے تھے-اور
کبھی گلہ پھاڑ کر بولنے لگتے تھے-پھر یہ ہوا کہ ایک
گروہ نمودار ہوا-اس نے عثمان کو قتل کرڈالا-اس کے
بعد لوگوں نے خود میری بیعت لی-زبردستی اور جبر
کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا-اپنی خوشی سے انہوں
"نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا
حضرت علی کے ابوبکر،عمر،عثمان سے جو تعلقات
رہے اور ان کا جو برتاؤ رہا وہ تاریخ میں درج ہے-ان
کے بیانات موجود ہیں-علی نے بتایا کہ انہوں نے بہت
کوشش کی کہ عثمان مروان اور بنو امیہ کے مفاد
پرستوں اور سازشیوں سے اپنی جان چھڑالیں-وہ
چاہتے تھے کہ عثمان ایسے اقدامات کرڈالیں جن سے
باغیوں کا غصّہ کم ہو اور مسائل کے زمہ داروں کا
احتساب ہو-لیکن علی کو اس باب میں ناکامی کا سامنا
کرنا پڑا-علی نے اس ساری فضاء کا تجزیہ پیش کیا
ہے-انہوں نے بتایا ہے کہ کیسے ایک طرف تو کبار
صحابہ ان سے ناراض ہوگئے تھے-دوسری طرف

ابوزر غفاری کی جلاوطنی اور عبداللہ بن مسعود و سلمان فارسی کو زدکوب کرنے جیسے واقعات نے شدید رد عمل پیدا کیا تھا-پھر کچھ ایسے عناصر بھی تھے جو عثمان کے منصب پر نظر جمائے بیٹھے تھے-وہ اس منصب پر خود براجمان ہونا چاہتے تھے-ایسے میں علی واضح کرتے ہیں کہ وہ اس سارے ہنگامے میں واحد آدمی تھے جو جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہے تھے-وہ عثمان کے سب سے بڑے حامی تھے-جب ابو زر غفاری کو مروان اور معاویہ کے دباؤ پر ربذہ جلاوطن کیا تو اس موقعہ پر علی نے ابو زر کو جو باتیں کہیں وہ بھی ان کی خیرخواہی کی گواہی دیتی ہیں-

"اے ابو زر تمہارا غضب خدا کی رضا کے لیے تھا-تو کرم کی امید بھی اللہ سے ہی رکھو-یہ لوگ تم سے اپنی دنیا کے یے خائف ہیں اور تم ان سے دین کے لیے خفاء ہوئے ہو-یہ لوگ جس چیز کے لیے تم سے خائف ہیں وہ چیز ان کے حوالے کردو-اور جس چیز کے لیے تم ان سے خفاء ہوئے ہو اس کو لیکر یہاں سے چلے جاؤ-ان کو جس چیز کی سب سے زیادہ حاجت تھی یعنی دین کی وہ تم نے ان کو نہیں دی اور جس چیز سے تم بے نیاز تھے اس کو انہوں نے تم کو نہیں

دیا یعنی دنیا-بہت جلد معلوم ہوجائے گا کہ نفع میں کون رہا؟اور کون سی شئے ہے جس پر حسد کرنے والے زیادہ ہیں-

آگر آسمان اور زمین کے دروازے بند ہوجائیں اور جس پر وہ دورازے بند ہوں وہ آدمی اللہ سے ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو تو اللہ اس کے لیے نجات کا رستہ ضرور پیدا کرے گا-

اے ابوزر!تم اس بات کا خیال رکھنا کہ کوئی تم سے انس نہ رکھے مگر حق تم سے انس رکھے اور تم سے باطل بھاگے تو یہ تمہارے لئے کافی ہے-اگر تم نے ان کی دنیا قبول کرلیتے تو تم کو دوست رکھتے اور اس دنیا کی کوئی چیز قبول کرلیتے تو تم کو امن دے ڈالتے "

یہ علی کی فکر کو بیان کرنے والی بہت ہی اہم باتیں ہیں-ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ علی کے ہاں امارت و حکومت اور مال و دولت کی کیا حثیت تھی-خطبہ شقشقیہ میں بھی آخر میں علی نے کہا تھا کہ "تمہاری اس دنیا کی حثیت میرے نزدیک بکری کی چھینک سے بھی حقیر ہے"

علی کے مکتوبات سے آپ سے اختلاف کرنے والے جید مہاجر اصحاب سے آپ کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے-

علی نے کبھی ان کے مقام اور مرتبے کا انکار نہیں
کیا-بلکہ علی کی کوشش تھی کہ ان کبار اصحاب کے
درمیان اختلاف اور انتشار پیدا نہ ہو-اور علی پریقین
تھے کہ ان اصحاب کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوگا
تو یہ پلٹ آئیں گے-اور تاریخ بتاتی ہے کہ علی کے
سمجھانے اور بار بار ان سے مکالمے نے ان کے
پلٹنے کی راہ ہموار بھی کی-زبیر بن العوام جنگ جمل
میں شریک نہ ہوئے-پلٹ پڑے-طلحہ کو دوران جنگ
غلطی کا احساس ہوا-وہ پیچھے ہٹے تو مروان کے تیر
کا نشانہ بنے-ام المومنیں عائشہ صدیقہ کو احساس ہوا-
لیکن بہت دیر ہوچکی تھی-شرپسند اور ہوس حکومت و
زر میں مبتلاء گروہ غالب آچکا تھا-اس لیے جنگ
جاری رہی اور فساد ہوتا رہا-

اختلاف اور انتشار پھیلانے والوں کے لیے یہ بہت
ضروری تھا کہ وہ اسلام کو شخصیات کے اختلاف کی
روشنی میں تقسیم کرکے دیکھنے کی روش کو پختہ
کرڈالیں-اور اس دوران اسلام کی روح کو غارت
کرڈالیں-حق کو مشتبہ کردیں-لوگوں کے زریعے حق
کو شناخت کرنے کی بدعت کو رواج دیں-اس کے لیے
نفرت اور دشمنی کی آگ جتنی بھڑکائی جاسکے اتنی
ہی کم ہے-ہم نے دیکھا کہ وہ کون سے کردار تھے

جنہوں نے ام المومنین اور کبار صحابہ کو بھڑکایا اور علی کے خلاف ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی-حضرت نائلہ جنہوں نے اپنے شوہر عثمان سے کہا تھا کہ علی ان کے حق میں بہتر بات کررہے ہیں اور یہ مروان آپ کے خون کو بہانے کی راہ ہموار کررہا ہے ان کی انگلیوں سے شام میں جذبات بھڑکائے گئے-جبکہ نائلہ کی اپنی نظر میں عثمان کے خون کو بہانے میں اصل کردار تو مروان کا بنتا تھا-

علی نے مشاجرات اصحاب رسول کو اس وقت کے سیاسی و معاشی اور سیاسی ڈھانچے کے اندر وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی-جبکہ ان کے مخالف اس وقت کی حالت کو قبل اسلام والے مکّی سماج اور مدنی سماج میں چلنے والی چتقلش کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کررہے تھے-

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ عنصر اس سماج سے غائب ہوگیا تھا اور اس کا کوئی کردار نہیں تھا-لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ علی کے ہاں غلط کاروں کی مخالفت اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا-اور نہ ہی وہ اس معاملے کو قبائلی تعصب کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے-

قریش کے اندر فخر و مباہات کے سلسلے موجود تھے-
ان کے درمیان کہیں کہیں تنازعات اٹھ کھڑے ہوتے
تھے-ان کے ہر قبیلے کے پاس اپنے فخر کے لیے
کچھ نہ کچھ تھا-بنو امیہ اور بنو ہاشم میں سیادت و
قیادت پر سرد جنگ موجود تھی-لیکن میرے پاس
ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ جب خود بنو ہاشم کے
بزرگ عباس نے خلافت کو ایک نسلی حق جانا اور
علی کو ثقیفہ جانے کو کہا-ایک مرتبہ ابوبکر کی
نامزدگی کو چیلنج کرنے کو کہا شوری میں جانے سے
روکا اور بیعت لینے کو کہا تو علی نے ان مشوروں
کو رد کرڈالا-علی نے یہ واضح کرڈالا تھا کہ وہ اس
کو نسلی یا قبائلی تنازعے کی شکل میں نہیں دیکھ
رہے-اور ان کا حتمی مقصد اقتدار نہیں ہے-اس لیے
-انہوں نے اپنے انداز میں مزاحمت کی
ہمیں علی کے نکتہ نظر کا پورا ادراک کرنے کے لیے
مکّہ کی سماجی زندگی کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں
-ضرور لانا چاہئے
مکّہ کے اندر قریش کے دو بڑے ذیلی قبیلے امیہ کی
اولاد اور ہاشم کی اولاد تھے-ان کے درمیان قریش اور
مکّہ کی سیادت کے لیے سرد جنگ ہمیشہ سے موجود
رہی مگر یہ گرم جنگ میں نہیں بدلی تھی-مکّہ ایک

قبیل داری سماج تھا-یہاں کوئی ریاست موجود نہ تھی-
یہ وادی غیر ذی ذرع تھی-لوگوں کی معشیت کا
انحصار تجارت پر تھا-مکّہ ایک تجارتی قدیم روٹ تھا-
اش شہر کی ایک مقدس حثیت بھی تھی-اس میں کعبہ
تھا جس کی نسبت ابراہیم سے تھی-مکّہ میں چھوٹے
چھوٹے مسائل قریش کے ذیلی قبیلے خود طے کرلیتے
تھے-جبکہ بڑے مسائل کے لیے دارالندوہ موجود تھا-
اس میں قریش کے سردار موجود ہوتے تھے-بنو امیہ
والے یہاں غالب حثیت رکھتے تھے-جبکہ بنو ہاشم کے
زمہ سقایہ کی زمہ داری تھی-تاریخ بتاتی ہے کہ
تجارت کو وسعت دینے اور بڑھانے میں بنوامیہ کی
کوششیں بڑھتی چلی گئیں-ابو طالب تو ایک وقت میں
اس عمل سے دست بردار بھی ہوئے-بنو امیہ کے
لوگوں نے بہت سا مال ومنال جمع کرڈالا تھا-مکّی
سماج کے اس دولت مند طبقے کی جو اخلاقی بدحالی
تھی اور ان کا جو ظلم تھا اس کو قران کا مکّی
سورتوں والا حصّہ اپنا موضوع خاص بناتا ہے-یہ
مالدار طبقہ سماج میں پھیلی بدحالی کا ومہ دار تھا-یہ
مستضعفین فی الارض کے خلاف تھا-اور اگر ہم
دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ مالدار طبقہ اس سماج
میں بت پرستی،توہم پرستی کے کلچر کو پھیلانے کا

زمہ دار بھی تھا-اور اس کے استحصالی عنصر کا
محافظ بھی تھا-قران قریش کے اس مالدار طبقے کو
ملاءالارض کہتا ہے-یہ مالدار طبقہ مکّی سماج میں
کسی بھی طرح کی تبدیلی کا سخت مخالف بنا ہوا تھا-
اور یہاں یہ بات بھی تاریخ کے طالب علموں یاد رکھنی
چاہئے کہ اس مالدار طبقے نے جتنا سخت رد عمل
محمد کی تعلیم پر دیا اتنا سخت رد عمل ان لوگوں کی
توحید پر نہیں دیا جن کو ہم حنفاء کے لقب سے جانتے
ہیں-میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ حنفاء نے
توحید کے عمرانی پہلو کی جانب کبھی توجہ نہیں کی
-اور مکّہ کے مشرکوں کو بھی چیلنج ہی نہیں کیا تھا
تاریخ میں ابوسفیان کا نام بہت ملتا ہے-ابوسفیان مکّہ کا
سب سے مالدار آدمی تھا-اس کے پاس غلاموں کی
ایک فوج تھی-ایک لشکر تھا جری نوجوانوں کا-اس
کے ہاتھ آہستہ آہستہ مکّی سماج کی سیادت آگئی تھی-وہ
بنو عبد شمس کا سردار تھا-اور وہ محمد کو مکّہ کی
سیاسی و سماجی زندگی کے لیے خطرہ تصور کرتا
تھا-وہ محمد کو قریش کے خداؤں کا منکر خیال کرتا
تھا-جب محمد اور مسلمان مدینہ کو ہجرت کرگئے تھے
تو اس کے حکم پر ہجرت کرنے والے لوگوں کے مال
اور گھروں پر قبضہ کرلیا گیا تھا-ابو سفیان مدینہ میں

اسلام کے بڑھتے اثر کو مکّہ کے لیے خطرناک خیال
کرتا تھا-اس نے مدینہ کی معاشی ناکہ بندی تک کرنے
کی کوشش کی تھی-ابوسفیان کو یہ بھی خطرہ تھا کہ
محمد اور ان کے ساتھی مکّہ کے تجارتی قافلوں کے
لیے سخت خطرہ بن چکے ہیں-اور ایسے ہی ایک
تجارتی قافلے پر حملے کی کوشش کے خلاف ابوسفیان
نے قریش مکّہ کو مدینہ میں حملہ آور ہونے کے لیے
لکھا تھا-جس کے نتیجے میں بدر کی پہاڑیوں کے
دامن میں مسلمانوں اور اہل قریش کی پہلی جنگ ہوئی
تھی-اس جنگ میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے
گئے جن میں عتبہ،اور ابو جہل عمرو بن ہشام بھی
شامل تھے-ابوسفیان اس دوران محمد اور اسلام کے
سب سے بڑے دشمن بنکر ابھرے تھے-ابوسفیان تھا
جس نے قریش اور دیگر قبائل کو مسلمانوں کے خلاف
پرانے نظم کو بچانے کے لیے متحد کرنے کی کوشش
کی-تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے مدینہ کے اندر اور
گردونواح سے یہود قبائل اور چند منافقین کا تعاون بھی
حاصل کیا-ابو سفیان کا ایک مکالمہ حرقل بادشاہ سے
تاریخ میں ملتا ہے جس میں ابوسفیان یہ کہتا ہے کہ
محمد کی اسلامی تحریک میں زیادہ تر غلام اور کم
حثیت والے لوگ شامل ہیں-ابوسفیان کو محمد کی جانب

سے معاشرے میں سماجی نظم کی بنیاد
قبیلہ،حسب،نسب کی بجائے اس کی بنیاد انسان ہونے
اور سب کے بنی آدم ہونے کو قرار دینے کو سب سے
بڑا جرم قرار دیا گیا-یہ وحدت کا وہ اصول تھا جو ابو
سفیان سمیت مکّہ کے مالدار طبقے کو کسی صورت
قبول نہ تھا-ان کو پتہ تھا کہ محمد اس جڑ کو اکھاڑ
پھینکنے کی کوشش کررہے ہیں جس کے اوپر قریش
کے مالدار طبقے کے تغلب کی عمارت استوار ہوئی
ہے-

محمد نے معاشرے میں پیدا ہونے والے ہر انسان کی
آزادی کو اس کا بنیادی حق تسلیم کرلیا-یہ محمد تھے
جن کا کہنا تھا کہ ہر بچہ پیدائیش کے وقت آزاد پیدا
ہوتا ہے-انہوں نے آزاد انسانوں کو غلام بنانے کی
مذمت کی-اہل مکّہ کے لیے تو اپنے سماج کے اندر
قبائلی بنیاد پر قائم تقسیم کے خلاف محمد کے نظریات
قبول نہ تھے لیکن محمد علیہ السلام تو اس سے بھی
آگے گئے اور انہوں نے اس حوالے سے عرب و غیر
عرب کی بنیاد پر فضیلت یا کسی امتیاز کو مسترد
کردیا-اور وحدت بنی نوع آدم کا تصور پیش کیا-
ایام حج کے دوران جاہلیت کے دور میں مدینہ سے جو

لوگ حج کرنے آتے تھے ان کی ملاقاتیں محمد علیہ

سلام کے ساتھ شروع ہوئیں تو ان کو محمد کے خیالات

بہت انقلابی اور یثربی معاشرے کی اصلاح کے لیے

بہت کارآمد لگے-یثرب کے عام باشندے ایک طرف تو

باہمی قبائلی چپقلشوں میں بہت متاثر ہورہے تھے-

دوسری طرف ان کی اکثریت سود خور تاجروں کے

چنگل میں پھنسے ہوئے تھے-یہ سود خود مالدار طبقہ

خود کو یہودی کہتا تھا-اور ان کی طاقت میں بے پناہ

اضافہ ہوچکا تھا-یہ مدینہ کے گردونواح میں اونچے

قلعے تعمیر کرکے رہ رہا تھا-جہاں ان کے بڑے باغات

تھے-یہ فوجی دستے بھی رکھتے تھے-ان کو اہل یثرب

سے افضل اور خدا کے پسندیدہ ہونے کا زعم بھی تھا-

اسلام کو مدینہ ک اندر سب سے بڑا علمی ،مذہبی اور

فکری چیلنج اسی سود خور طبقے کی جانب سے پیش

آیا-اس طبقے نے اپنی نام نہاد دینداری اور مذہبیت اور

خود کو کتاب کا سب سے بڑا عالم ہونے کی بنیاد پر محمد،قران اور اسلام کے خیالات کو چیلنج کیا-اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ محمد ایسے دین کو لیکر آغے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی ہے-اور انہوں نے محمد کے تصور مساوات کو چیلنج کرنے میں کوئی کسر نہ ٹھا رکھی-اپ قران کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کی

مسند خالی ہوجائے گی تب مجھے پہچانوگے

رات کا آخری پہر تھا-سردی اپنے جوبن پر تھی-کوفہ کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا-دور کہیں سے کبھی کبھی کتّوں کے بھوں بھوں وقفے سے سنائی دے

جاتی تھی-ایسے میں کوفہ کے ایک محلے میں ایک
سادہ سے بنے مکان کے صحن میں چراغ آخر شب
جلتا تھا-اس مکان کے سارے مرد و زن لگتا تھا بہت
جلد اٹھنے کے عادی تھے-صحن میں سب سے آگے
سیاہ چادر اوڑھے ایک آدمی کھڑا تھا-اس کے پیچھے
مرد و عورت صف باندھے کھڑے تھے اور سب سے
آگے جو آدمی امامت کررھا تھا وہ کافی شیریں لحن
تھا-اس کی آواز میں بہت درد تھا-لے پرسوز تھی اور
اس کے لبوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے

قل اعوذ بالرب الناس،ملک الناس و الہ الناس و من
شرالوسواس الخناس ،الذی یوسوس فی الصدور الناس
من الجنّۃ والناس

الحمد للہ رب العالمین،الرحمان الرحیم،مالک الیوم
الدین،ایاک نعبد و ایاک نستعین،اھدناالصراط

المستقیم،صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولاالضالین

یسن،والقران الحکیم،انک علی صراط مستقیم.........................

جو آدمی تلاوت کررہا تھا اس کی آواز صحن سے باہر نہیں جارہی تھی-صحن کے اندر ایک سماں بندھا ہوا تھا-تھوڑی دیر تک قیام،تلاوت ،رکوع ،سجود کا عمل چلا اور پھر اس سے فارغ ہوکر سب نے ہاتھ اٹھائے- جس آدمی نے امامت کرائی تھی اس نے یوں دعا کرنی شروع کردی

ربنا اتنا فی الدنیا و فی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار،ربنا اغفرلی ولی والدی وللمومنین یوم الحساب،ربنا تقبل منا و تب علینا انک انت التواب الرحیم..................

دعا جاری تھی اور گریہ بھی-ساتھ ساتھ سب کی
آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بھی جاری تھی-دعا
سے فراغت کے بعد ایک عورت اٹھی اور اس نے
سامنے پانی کے بھرے گھڑے سے پیالے میں پانی
انڈیلا اور دو کجھوریں لیں اور لیکر امامت کرانے
والے آدمی کی جانب بڑھی-اس نے پاس جاکر کہا

-اے میرے والد! یہ پانی اور کچھور لے لیں

مرد جس کی داڑھی میں مہندی کا خضاب تھا جو بہت
گھنی تھی-سر سے بال صاف تھے-سفید رنگ کا لباس
تھا اور شانوں پر کالے رنگ کی چادر تھی-قد درمیانہ
تھا-پیٹ فربہی مائل تھا-آنکھیں کتابی تھیں-گندمی رنگ
تھا-اس نے دو کجھور لیں اور ان کو کھالیا-پھر پانی
پیا-اس کے بعد کہنے لگا

بیٹی زینب !باقی لوگوں کو بھی سحری کے لیے کھانے اور پینے کو دو-اس طرح سے جس کو زینب کہا گیا تھا بس نے باقی اہل خانہ کو بھی سحری کا سامان تقسیم کیا-سارے گھر نے پانی اور کجھور سے سحری کی-اور پھر سحری کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسی آدمی نے ہاتھ اٹھائے تو سارے اہل خانہ نے تقلید کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا دئے-

الحمد لله رب العالمین علی ہذا الطعام و شرب ....

آج رمضان کی 21 تاریخ تھی-آہستہ آہستہ پورے کوفہ کے باسی جاگ گئے تھے-سب گھروں میں سحری کی جارہی تھی-کئی گھروں میں نوافل و تلاوت قران کا سلسلہ جاری تھا-جس مکان کےباسیوں کا حال اوپر بیان ہوا-وہ مکان مسلمانوں کے خلیفہ اور امام علی کا

مکان تھا-جہاں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھے-یہ
وہ زمانہ تھا جب مسلم ریاست کے بہت کم حصّے پر
خلیفہ عملداری رہ گئی تھی-اکثر علاقے بغاوت کرنے
والوں کے قبضے میں آچکے تھے-یہ گھرانہ اپنے ہی
قبیلے کے بہت سارے لوگوں کی حمائت سے محروم
ہوچکا تھا-وجہ تھی علی کی اصول پسندی کی زندگی-
خلیفہ بننے کے بعد بھی علی نے مال و دولت سے
رغبت نہ رکھی اور سب کے لیے معاش میں مساوات
کا اصول متعارف کرایا-لوگوں میں طبقاتی خلیج کے
خاتمے کے لیے اقدامات کئے اور سادہ طرز زندگی کو
اپنا اصول بنالیا-جبکہ دوسری طرف تو مال لوٹانے کی
روش تھی-امیر شام ایک محل میں رہتا تھا-اس کے
احباب اور رفقاء کے پاس دولت کی ریل پیل تھی-اور
اس نے عوام پر ناجائز ٹیکسوں کی بھرمار کررکھی

تھی-وہ عوام کی بربادی کی قیمت پر اپنے اقرباء کو
خوش رکھے ہوئے تھا-اس کی ساری سخاوت کا منبع
عوام سے لوٹی دولت تھی-اور اس سخاوت کو دیکھتے
ہوئے خود خلیفہ کے بھائی عقیل نے امیر شام کے
دربار میں شرکت کرلی اور دین پر دولت کو ترجیح
دے ڈالی-

لیکن علی نے اپنی روش نہ بدلی اور وہ اپنے اصولوں
پر چلتے رہے-ان کی زندگی کا نچوڑ ان کا
تجربہ،مشاہدہ،علم تھا جو انہوں نے آخری رسول محمد
علیہ السّلام کی رفاقت میں رہ کر حاصل کیا تھا-ان کو
یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ محمد کے گھرانے سے تعلق
رکھتے تھے-محمد کی پرورش ان کے گھر ہوئی تھی
اور ان کی پرورش محمد کے گھر ہوئی تھی-دونوں
نے اکٹھے تحریک کا آغاز کیا تھا-علی کا

بچپن،لڑکپن،جوانی کا جو عرصہ تھا وہی اسلام کے
جنم،بچپنے،لڑکپن اور جوان ہونے کا عرصہ تھا-اور
علی اس تحریک کے ہر سنگ میل کا اہم کردار تھا-اس
لیے علی کے پاس یہ صلاحیت تھی کہ وہ زندگی کے
اصولوں کو مرتب کرسکے اور ایک رول ماڈل پیش
کرسکے-

علی نے اپنے استاد محمد سے یہ سیکھا تھا کہ
تقوی،پرھیز گاری،للہیت ،مذھبیت اور دین داری کا
شہود انسان کی دنیاداری میں اگر نہیں ہوتا تو اس کی
کوئی قدر و قیمت نہیں ہے-وہ جانتے تھے کہ جب ایک
انسان اللہ تعالی کے الہ ہونے کی گواہی سے پہلے باقی
الہ کا انکار کرتا ہے تو اس سے مراد
مٹی،گارے،پتھر،لکڑی کے الہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس
میں نفس کا الہ باطل بھی ہوا کرتا ہے جس کا انکار

بہت ضروری ہے-خواہشات نفسانی کے جہنم کو گلزار بناکر دکھانے والا الہ نفس وہ باغی و سرکش ہے جو شرک اکبر کے خاتمے کے بعد بھی سراٹھانے لگتا ہے-اور یہ وہ شرک ہے جس کے عود کرنے کا خطرہ محمد کو اپنے آخری ایام میں بھی تھا-

مدینہ میں ایک روز محمد کے مرض الموت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو آپ ٹیک لگاکر بیٹھ گئے-اور اہل مدینہ میں اپنے اصحاب کو جمع کرلیا-اور ان سے کہنے لگے کہ

مجھے تمہارے بارے میں یہ فکر نہیں ہے کہ تم میرے بعد پھر سے لات و منات کی پوجا کرنے لگو گے-مجھے یہ بھی ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد پھر سے خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگوگے-مجھے خطرہ ہے کہ کہیں تم میرے بعد ایک

دوسرے کے خون کے پیاسے نہ ہوجاؤ اور ہر امت
کے لیے ایک فتنہ یا آزمائش ہوا کرتی ہے-تمہاری
آزمائش مال و دولت ہے-میں تمہیں اپنی عترت کے
بارے میں خبردار کرتا ہوں-تم سے اپنی خدمات کا
کوئی اجر نہیں مانگتا ہوں مگر صرف یہ کہ میری
عترت سے مودّت سے پیش آنا-تم میں دو بھاری بھرکم
چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں-ایک میری قران اور دوسرا
عترت-تم جب حوض کوثر پر مجھ سے ملو تو ان
-دونوں سے تمہارا تعلق منقطع نہ ہوا ہو

اس سے قبل بھی ایسے واقعات رونماء ہوچکے تھے
کہ جن سے علی نے یہ خیال کرلیا تھا کہ محمد کے
بعد اس تحریک کی رھبری کے فرائض ان کو سرانجام
دینے ہیں-اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ رھبری ایک
فرض ہے جس سے ان کو تادم مرگ عہدہ براہ ہونا

ہے-اس لیے علی کو کسی کی پسند ناپسند کی فکر نہیں
تھی اور انہوں نے رھبری کے فرائض کی ادائیگی
اپنے اوپر فرض کرلی تھی-اور جو فہم اسلام اور فہم
دین یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ زندگی کو
گزارنے کا جو اسلوب اور جو ڈھنگ انہوں نے مکتب
نبوی سے سیکھا تھا اس کو بیان کرنے اور اس پر
عمل پیرا ہونے میں ان کو کوئی عار محسوس نہیں
ہوتی تھی-ان کا علم محمد اور قران سے براہ راست
تھا-اس میں کوئی واسطہ نہیں تھا-کوئی پردہ نہیں تھا-
وہ محمد کی جلوتوں اور خلوتوں دونوں کے گواہ تھے-
وہ محض شاہد ہی نہیں تھے بلکہ ان کے پاس
تجزیہ،پرکھ،تفقہ،دقیقہ سنجی کا مادہ بی تھا-وہ راوی
محض نہ تھے-بلکہ ان کو ہر واقعے اور ہر قول کے
سیاق و سباق سے آگہی تھی-وہ قران کے نزول کے

عینی شاہد تھے-بلکہ یہ نزول جن واقعات کے تناظر
میں ہوتا تھا وہ اس کے مرکزی کردار بھی تھے-اس
لیے ان کو قران شناسی کا وہ ملکہ حاصل تھا جو کسی
اور کو کہاں تھا-وہ سیرت محمدی کے سب سے ثقہ
راوی تھے-کیونکہ سیرت محمدی اور سیرت علوی
کے ماہ و سال میں بہت سے ماہ و سال مشترک تھے-
وہ قران اور سیرت محمدی دونوں کے سب سے بڑے
شناسا بھی تھے اور ان دونوں کے سب سے کامل پرتو
بھی تھے-اسی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ اسلام کے
اندر عقائد اور اعمال کے درمیان کیسا نامیاتی رشتہ
ہے-اور ان کا یہ ماننا تھا کہ "جنت اور جہنم اصل میں
انسان کے اعمال سے تشکیل پاتی ہیں-وہ ان کی تخلیق
اسی دنیا میں اپنے اعمال سے کرتا ہے-اور وہ قول کو
جب عمل سے متضاد کرلیتا ہے تو ایک طرف واپس

شرک کی جانب لوٹتا ہے-اپنے نفس کو الہ ماننے کی طرف قدم بڑھاتا ہے-ایسے میں وہ اس قدر اندھا ہوجاتا ہے کہ اگر وہ قران کی جانب بھی لوٹے تو اس کا مطلب بھی وہی اخذ کرتا ہے جو اس کا نفس اس کو "بتلاتا ہے

علی کو اس وقت اندازا نہیں تھا کہ محمد بار بار جب موقعہ ملتا ہے تو اپنے اصحاب کو جمع کرکے کیوں بار بار قران اور عترت سے وابستہ رہنے اور جرج یعنی خون خرابے سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں- محمد کی اس فکر کے پس منظر سے آگاہی علی کو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ملی اور اس لیے انہوں نے رھبری کے مشکل ترین فریضے کو نبھانے کا فیصلہ -کرلیا

تاریخ ہمیں ایک اور واقعے کی خبر بھی دیتی ہے-اور
وہ واقعہ فتح مکّہ کے بعد کاہے-جب محمد مکّہ میں
ہیں-اور وہ مولئفۃ قلوب کو اور اہل قریش کو زیادہ مال
و دولت دیتے ہیں-ایسے میں انصار کے دلوں میں
خدشات ابھرتے ہیں کہ کہیں محمد اب مکّہ میں تو نہیں
رہ جائیں گے-اور محمد اہل انصار کی کیفیت کو بھانپ
جاتے ہیں اور ان سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں
کہ

اہل مدینہ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ اہل قریش
کے پاس دنیا کی دولت رہ جائے اور تم محمد کر لے
جاؤ

یہ بات سنکر انصار کے چہرے کھل اٹھے تھے-اور
محمد ان کے ساتھ واپس آئے اور ان کے درمیان ہی
انہوں نے وصال کیا-اس واقعے کا ایک پہلو یہ بھی تھا

کہ محمد کا مدینہ واپس آنا اور وہیں پر انصار کے
درمیان فوت ہونا اور مدینہ سے نکل کر مسلمانوں کا
مکّہ کی جانب جاتے ہوئے نمازوں کو مسافر کی طرح
ادا کرناعلامت تھا کہ اسلام کی روح اور مغز کے اول
و آخر شناسا وہ ہیں جنہوں نے رفاقت مصطفی میں فتح
مکّہ سے پہلے وقت گزارا اور وہ ہر طرح کے حالات
میں محمد کے ساتھ رہے-پھر انہی دنوں خود قران نے
بھی فتح مکّہ سے پہلے ایمان لانے والوں اور جہاد و
انفاق کرنے والوں کو بعد والوں پر فوقیت دی-اسی
طرح بدر کی جنگ اول میں شرکت کرنے والوں کو
بعد والوں سے زیادہ افضل قرار دیا-اس کلیے کو مد
نظر رکھتے ہوئے بھی علی رھبری کے لیے سب سے
موضوع آدمی خیال کئے جاتے تھے-رھبری
رفاقت،علم،تقوی،تحریک میں کردار اور صلاحیت

جیسے عوامل سے ملکر متشکل ہواکرتی ہے-اور یہ
اصول محمد نے بنایا تھا-کیونکہ اہل قریش کے ہاں سن
رسیدگی بزرگی کی علامت ہواکرتی تھی-وہ زیادہ عمر
والوں کو ندوہ میں بٹھاتے تھے-جبکہ محمد نے اپنے
لشکروں کی قیادت نوجوانوں کے سپرد کی-اور انہوں
نے منصب گورنری علی اور معاذ کو کم عمری میں
دی-انہوں نے مدینہ کا نگران علی کو بنایا-اور پھر حج
کے موقعہ پر سورہ برات دےکر علی کو بھیجا-عمر
رسیدگی کو انہوں نے نظرانداز کیا-اسامہ کو لشکر کا
سپہ سالار بنایا-ان مواقع پر مہاجرین میں جو مکّہ کے
کلچر کے اثرات سے ابھی باہر نہیں آئے تھے انہوں
نے وہی

طریق اپنانے کی کوشش کی جوکہ اہل قریش کے مکّی
سماج میں رائج تھے-مگر محمد نے اس کی اجازت نہ

دی-اگر اس سماج کی اجتماعی ذہنیت کے حوالے سے
ایک تاریخی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ
اسلامی تحریک جس کلچر اور جس فکر کو اجتماعی
روح کا حصّہ بنانے جارہی تھی اس کو سب سے بڑا
چیلنج ان لوگوں سے تھا جن کی اس تحریک میں
شرکت کو کم مدت ہوئی تھی-وہ اپنے ساتھ پرانے طور
طریقوں اور رواجوں کو ساتھ لیکر آگئے تھے-اور ان
کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ معاشرے میں بکریاں
چرانے والے بنی تمیم کا ایک لڑکا نمایاں مقام کا حامل
ہوجائے-وہ اسلام کی تحریک کے اولین کرداروں کے
سماجی و معاشی پس منظر سے خاصے بے چین
تھے-ان کو یہ اپنی نجابت و نسب و جسب کے خلاف
ایک توھین والا عمل لگتا تھا-پھر ان کے ہاں عربیت
کے سب سے بہتر ہونے کا جو زعم تھا اس کی کوئی

گنجائش اسلام میں نہیں تھی-لیکن وہ تو
عراق،ایران،یمن،وسط ایشیا،مصر سے اسلامی تحریک
میں شامل ہونے والوں کو کوئی اہمیت دینے کو تیار
نہیں تھے-پھر ان کو برابری،مساوات اور انسانیت کے
مشترکہ وصف کا ادراک تک نہ تھا-اصل میں تحریک
کی بنیاد نہ تو قبیلے کی شناخت پر تھی-نہ نسب پر،نہ
ہی حسب پر،نہ خون یہاں بنیاد تھا-نہ جنس بنیاد تھی-نہ
ذات تھی،نہ نسل تھی-نہ خطہّ تھا-یہ جو قبیل داری
سماج کے سب سے مراعات یافتہ طبقات تھے اور قبیل
داری نظام سے فائدہ اٹھانے والے تھے ان کو یہ
تحریک اول دن سے سمجھ نہیں آرہی تھی-ان کو محمد
پر غصّہ تھا-کہ وہ غلام،یتیم،بیوہ،غریب،اپنے قبیلے
اور وطن سے بے وطن ہونے والوں اور اشراف سے
آنے والوں کو ایک شناخت اور اخوت کے رشتہ میں

پیروتا ہے-اخوت تو قبیل داری سماج میں ایک قبیلے
کے لوگوں یا دو حلیف قبیلوں کے درمیان ہوسکتی
تھی-مگر محمد نے اخوت اور برادری کے معنی ہی
تقسیم کرڈالے تھے-اہل قریش نے محمد کو بطور ایک
مسیحا اور ایک نجات دھندہ کی شکل میں دیکھنے کی
بجائے ان کو ایک قریشی اور اس سے نیچے آکر ایک
ہاشمی اور اس سے بھی نیچے آکر آل عبدالمطلب کے
طور پر دیکھنے کی کوشش کی-اور ان کو محمد کے
طور طریقے الگ محسوس ہوئے-انہوں نے بنو ہاشم
سے اپنی چتقلش کو محمد کے اندر بھی دیکھنے کی
کوشش کی-بنو امیہ کے سرداروں کی اس روش سے
ہم اندازا لگاسکتے ہیں کہ انہوں نے بعد از وفات محمد
کیوں وہ راستہ اختیار کیا جس کے خلاف اسلام کی
-تحریک کا ظہور ہوا تھا

علی نے تحریک کی روح کو بچانے کے لیے رھبری
کے فریضہ کو اپنایا-اور انہوں نے مکّی سرداروں کے
چلن اور ان کی سوچ کا بخوبی اندازا لگالیا تھا-اور وہ
تحریک کے بعض پرانے سپاہیوں کے اندر پرانے
مرض کے عود کرآنے کے خطرے سے بھی آگاہ
تھے-اسی لیے ان کی جانب سے احتجاج اور مزاحمت
کا سلسلہ جاری رہا-اور انکو حالات نے مجبور کیا کہ
-وہ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں

علی نے اقتدار اس لیے حاصل نہیں کیا تھا کہ وہ پہلے
سے موجود ایک مراعات یافتہ طبقے(جس کا جنم
حضرت عثمان کے دور میں ہوا تھا اور اس کے
مقابلے میں احتساب کی تحریک کھڑی ہوگئی
تھی-)کے مقابلے میں اپنا ساتھ دینے والوں کے اندر
ایک نیا مراعات یافتہ طبقہ تیارکردیں-اور ان کو لوگوں

کے استحصال کی کھلی چھٹی دے ڈالیں-نہ ہی وہ اپنے
عمال اور گورنروں کو شتر بے مہار بنا سکتے تھے-
وہ اس کے برعکس پورے سماج سے اقرباء پروری
کے کلچر کا خاتمہ کرنے پر تل گئے تھے-مساوات ان
کے ہاں ایسا اصول تھا جس کی رو سے وہ فضیلت کو
میعار نہیں ٹھہراتے تھے-یہاں معاش کی ضرورتیں
معیار تھیں اور اس میں ایرانی،مصری و خراسانی و
عربی میں کوئی فرق نہیں تھا-جبکہ بہت سارے
عراقی،مصری،ایرانی،مدنی و مکی ایسے تھے جو یہ
سوچ رہے تھے کہ اقتدار ان کی حمائت سے علی کے
پاس رہا تو وہ بھی مراعات یافتہ ہوجائیں گے-لیکن ایسا
کچھ بھی نہ ہوا-علی نے گورنر اور عمال مقرر کرنے
کا سخت معیار طے کیا-اور پھر انہوں نے وسائل کی
بندر بانٹ کو بھی سختی سے بندکرڈالا-لیکن پرورے

سماج میں دولت اور نفسانی خواہشات کی پیروی کا
کلچر عام ہوچکا تھا-ایسے میں علی کی آواز نقار خانے
میں طوطی کی آواز بنتی چلی گئی-اور ان کی تنہائی
میں اضافہ ہوتا چلا گیا-علی اور ان کے اہل خانہ بے
گانگی اور تنہائی کی منزل سے پہلی مرتبہ آشنا نہیں
ہورہے تھے-ایک زمانہ تھا جب علی نے اپنی آنکھوں
سے دیکھا تھا کہ کیسے محمد،آل ابی طالب و دیگر
رفیقان و ہمدردان محمد کو شعب ابی طالب میں قید
کردیا گیا تھا-اور یہاں مصائب کا شکار ہوکر ابی طالب
و خدیجہ چل بسے تھے-پھر علی نے دیکھا تھا کہ
کیسے ان پر اور ان کے خاندان سے وفات محمد کے
بعد اہل مدینہ کی اکثریت نے سلام دعا ترک کرڈالی
تھی-اور ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا-لیکن علی
اور ان کے اہل خانہ حق پر قائم رہے-اور پھر جب

مدینہ سے کوفہ آئے تو رفتہ رفتہ یہاں بھی تنہائی کا
عمل شروع ہوگیا-لیکن علی نے اپنا راستہ ترک نہ کیا-
انہوں نے انحراف کو ناگزیر قرار دینے اور حرام
رستوں سے حلال مقصد کو حاصل کرنے کے مشورے
-کو سرے سے رد کرڈالا

اصل میں علی کی تنہائی کا سبب منافقت کو رد کرنا
تھا-انہوں نے موقعہ پرستی کے کلچر کو لات ماردی-
میں کبھی سوچتا ہوں کہ علی کو اپنے وقت کے
ترمیم پسندوں اور نام نہاد سوشل ڈیموکریٹس کا سامنا
تھا-ان کو کہا جارہا تھا کہ انقلاب کو اپنے ہاتھوں سے
تباہ کردیا جائے اور ایسا رستہ اپنالیا جائے کہ جس میں
اجتماعیت اور سب سے عدل پر زور نہ ہو-گویا
اسلامی تحریک سے جس سماجیات نے جنم لیا تھا اس

کو بالغ ہونے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا
جائے-

ان اپنی عمل داری میں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا
تھا جو ایک طرف تو امیر شام کے بارے میں کچھ
نہیں جانتے تھے-وہ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا
تھے کہ امیر شام کی جانب سے تحریک بس چند ایک
مطالبات پر مبنی ہے-اگر کوشش کی جائے تو یہ لڑائی
ختم ہوسکتی ہے-وہ بنا لڑے جیت جانے اور آرام سے
بیٹھکر ثمرات لینے کے خواہاں تھے-جبکہ علی امیر
شام کو بھی جانتے تھے،اہل قریش کو بھی-وہ ان
سارے کرداروں سے واقف تھے جو عثمان کے کرتے
کو پہننے کی جلدی میں تھے اور ان پر حملے کے
وقت گھروں میں بیٹھے رہے اور بعد میں قصاص کے
نعرے بھی لگانے لگے تھے-وہ ان تمام کرداروں سے

شناسا تھے جو "نفس "کو الہ مان بیٹھے تھے-یہی وجہ ہے کہ علی نے ان کو باور کرایا کہ وہ فریب میں مبتلاء ہیں-امن ایسے نہیں آئے گا-وہ چاہتے تھے کہ اہل شام سے چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کرنے کے فیصلہ کن معرکہ لڑا جائے-اور اسی کے لیے وہ اہل عراق کو تیار کررہے تھے-

اس قدر خراب حالات میں بھی جبکہ علی خود ان کا زکر بار بار کرتے تھے انہوں نے بڑے لشکر کی تیاری شروع کردی تھی-اور یہ لشکر ترتیب پانے کے قریب تھا-وہ ایک فیصلہ کن جنگ امیر شام سے لڑنے کے خواہاں تھے-انہوں نے رجب سے اپنے خطبات کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا-اور اب رمضان کی 21 تاریخ آگئی تھی-وہ پرامید تھے کہ اب کی بار جو معرکہ ہوگا وہ فیصلہ کن ہوگا-باطل کی جڑ کٹ کر رہے گی-

وہ سحری کے بعد اذان کی آواز سنکر گھر سے نکلے-
اور جامع مسجد کوفہ میں پہنچ گئے-فجر کی نماز کے
لیے اقامت کہی گئی-اور انہوں نے امامت کرانا شروع
کی-دوران نماز ہی ابن ملجم خارجی نے زہر سے بنی
تلوار کا وار آپ کے سر پر کیا-اور رہبری کرنے
والے امام کی زندگی کے سفر کو اپنی طرف سے
-اختتمام کی جانب روانہ کرڈالا

علی شدید ضرب کے باوجود ہوش میں تھے-اور آپ
نے اپنے آپ کو مکمل کنٹرول کررکھا تھا-ان کا آحری
وقت آن پہنچا تھا-اور میں نے بہت عرق ریزی سے یہ
تلاش کرنے کی کوشش کی کہ وہ آخری وقت میں سکر
موت طاری ہونے سے قبل کیا کررہے تھے-ان کو کس
چیز کی فکر تھی-اور کیا خیالات ان پر غلبہ کئے
ہوئے تھے؟تاریخ کی تمام کتب بتاتی ہیں کہ علی نے

اپنے قاتل سے بھی انصاف کرنے کی تلقین کی-اور ابن
ملجم کے قاتلانہ حملے کے بعد وفات سے کچھ دیر
پہلے انہوں نے اپنے گرد لوگوں سے ایک گفتگو بھی
کی-جس کو میں یہاں درج کررہا ہوں

اے لوگو!ہر آدمی موت سے فرار اختیار تو کرتا ہے
مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی مہمان ہے جس سے
ملاقات کرنی پڑتی ہے-ہم جس مدت زندگی کو آگے کا
سفر خیال کرتے ہیں وہ تو ہمیں موت کی جانب لیجارہا
ہوتا ہے-ہم زندگی کی رسی کو جتنی بھی دراز کرلیں
-موت نفس کے قریب ترہوتی جاتی ہے

میں نے زندگی کے کتنے دن اس راز کو پانے میں
صرف کرڈالے-لیکن میں نے یہ جان لیا کہ خدا نے اس
راز کو یعنی موت کے دن اور وقت کو تم سے راز ہی

رکھا ہے-یہ علم مخزون ہے-تو میری تم سب کو یہ وصیت ہے کہ

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ،اور محمد صلی علیہ وآلہ وسلم کی کسی بھی سنت کو ضایع مت کرو،ان دونوں ستونوں کو یعنی توحید اور سنت کو قائم رکھو-یہ دونوں چراغ ہمیشہ روشن رکھو،جب تک تم ان دونوں سے دور نہ ہوں اور اس بارے گمراہ نہ ہوں تو کسی کو تم پر سرذنش کرنے کا حق نہیں ہے-تمہارا رب بہت رحیم ہے-اس نے ہر کسی کو اس کی استعداد کے مطابق مکلّف کیا ہے-اور نادان پر اس نے کم بوجھ ڈالا ہے-تمہارا دین بہت سیدھا ہے-اور تمہارا امام علیم ہے-کل تک میں تمہارا ساتھی تھا-آج تمہارے لیے پندو عبرت ہوں-اور آنے والے کل میں تم سے جدا ہوجاؤں گا-اللہ میری بھی مغفرت فرمائے اور تمہاری

بھی-اس لغزش گاہ میں اگر میرے قدم ثابت رہے تو یہ تمہاری منزل ہے اور اگر میرے قدم لڑکھڑا گئے (اگر زندہ رہا تو یہ تمہاری تمنا ہے،مرگیا تو کوئی بات نہیں)تو کوئی بات نہیں-

کیونکہ ہمارا سفر زندگی ایسے ہے جیسے ہم شاخوں کے سایوں میں رہتے ہوں-جو کم یا زیادہ ہوتے رہتے ہیں-ہم تو ہواؤں کی گزر گاہ میں تھے-جن کے جھونکے ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں-اور ایسے ابر کے سائے میں تھے کہ جو فضاء میں پھٹ گئےاور زمین پر جن کا نقش مٹ گیا-

میں تمہارا ہمسایہ تھا ،میرا بدن کچھ عرصہ تمہارا ساتھی رہا-بہت جلد تم میرے بدن کو بے حس و حرکت دیکھو گے جبو پہلے حرکت کرتا تھا-،پہلے گویا تھا

اب خاموش ہے-کتنا اچھا ہو اگر تم میری خاموشی اور
میرے اعضاء کے سکون سے نصحیت حاصل کرو
کیونکہ یہ عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے اچھا
وعظ اور بلیغ منطق ہے-اور سننے والے کے یے موثر
تقریر ہے-

میرا تم سے فراق اس شخص کی طرح کا فراق ہے جو
کل پھر تم سے ملاقات کا منتظر ہوگا-آنے والے کل
میں تم میرے عہد کو یاد کروگے-اور میرا باطن اور
میرا راز تم پر منکشف ہوگا(جب بنو امیہ کی سختیاں
جھیلوگے)جب میری جگہ دوسرا آجائے گا-اور میری
مسند خالی ہوجائیگی تب تم مجھے پہچانوگے-

علی یہ وصیت کرنے کے تھوڑی دیر بعد خالق حقیقی
سے جاملے تھے-اور ایسے میں پاس ایک مرتبہ پھر
زینب تھی-زینب کو یاد آرہا تھا کہ کیسے وہ ننھی سی

تھی جب اس کے نانا فوت ہوئے تھے اور سارے مدینہ والے ثقیفہ میں چلے گئے تھے-یہ محمد کے گھر والے تھے اور علی و فاطمہ تھے جنہوں نے تجہیز و تکفین کی تھی-اور پھر اماں فاطمہ کی وفات ہوئی تو ان کی تدفین بھی رات کے اندھیرے میں خاموشی سے کی گئی تھی-اور آج بابا علی تھے جو کوفہ میں مدینہ سے سینکڑوں کوس دور فوت ہوگئے تھے-جنازہ گھر میں موجود تھا-تدفین پر مشورے ہورہے تھے-دو بڑے خطرات تھے-ایک خارجی اور دوسرا اہل شام کے ہرکارے-جن سے خطرہ تھا کہ قبر کھود نہ ڈالیں اور لاش کی بے حرمتی نہ کریں-تاریخ کہتی ہے کہ رھبر اسلام اور امام الائمہ کی قبر کو اہل بیت نے چھپاکررکھا-اور یہ راز سینہ بسینہ یونہی آگے منتقل ہوتا رہا-صرف امام علی کی قبر ہی نہیں بلکہ ایک

زمانے تک اہل بیت کی قبروں کو ایک سربستہ راز

رکھا گیا-یہ قبروں کی حفاظت سے کہیں زیادہ ایک

تاریخ،ایک ورثہ اور ایک علامت کی حفاظت تھی-ایک

ایسا جادوئی منتر ان علامتوں سے جڑا ہوا تھا کہ جس

سے آشنا ہونے والے تاریخ کے مسخ کرنے والوں کے

چہرے فوری طور پر پہچان لیتے ہیں-

علی محمد کے بعد اسلامی تحریک کے سب سے بڑے

گواہ اور شناسا تھے-اور انہوں نے اپنی گواہی اور

شناسائی کو کبھی مصلحتوں کی نظر نہیں ہونے دیا-

انہوں نے معاشرے میں عدل اور انصاف و مساوات کو

عقیدے کا جزو قرار دیا-اور عدل،انصاف اور مساوات

کو ایک عالمگیر سچائی اور اصول بنایا-اس کا مطلب

تھا کہ ان اقدار کے نفاز کا مطلب ان کے ثمرات سب

تک پہنچانے ہیں چاہے وہ کسی مذہب،کسی

عقیدے،کسی رنگ،کسی نسل،کسی ذات،کسی فرقہ اور کسی خون سے تعلق رکھنے والے ہوں-یہ ایک ایسی سچائی تھی جو عربی و عجمی ،قریشی غیر قریشی ،اموی و تمیمی کا فرق کرنے والوں کو کبھی ہضم نہ ہوئی-لیکن یہ سچائی اپنی جگہ موجود ہے-

آج المیہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آل سعود ،صہیونیت اور سامراجیت نے ملکر اسلام کی اس سچائی کو پراگندہ کرڈالا ہے-وہ سرمایہ دارانہ بربریت کے ساتھ اس سچائی کو اپنی خون خواری سے گدلا کرچکے ہیں-جبکہ دوسری طرف ایسے مہاجنی شیعہ بھی ہیں جن کے ہاں سیم و زر ہی سچائی کے پیمانے ہیں-وہ علی اور مکتب اسلام کے نام پر سیاہ حاشئے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں-دیکھا جائے تو سچائی کے قاتلوں نے سچے ہونے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے-اور

ہماری عوام کی اکثریت ابھی تک ان ڈھونگیوں کے

-ڈھونگ کو سچ خیال کررہی ہے

ٹی وی پروگراموں میں عامر لیاقت حسین ڈھونگی کے

پروگرام کی مقبولیت سب سے زیادہ ہے جو سب سے

زیادہ سچائی کا قاتل اور بے ہودہ انسان ہے-جس نے

اپنی ماں کو تھپڑ مارکر گھر سے نکالا تھا تو سارے

محلے نے دیکھا تھا اور ہم اس کے فہم کی سب سے

-زیادہ داد دینے پر تلے ہیں

علی کا یہ سچ عالم گیر سچ ثابت ہورہا ہے کہ جب

سچائی کا علمبردار مسند خالی کرجاتا ہے تو اس کو

پہچانا جاتا ہے-میں تو یہ کہتا ہوں کہ آج معاملہ اس

سے بھی زیادہ خطرناک ہوچلا ہے-اب تو مسند خالی

-ہونے کے بعد بھی پہچان ہونا مشکل ہوجاتی ہے

سماج سے ایک ایک کرکے سچائی بیان کرنے والے
رخصت ہوتے جاتے ہیں-اور سب کی تنہائی کا زمہ
دار یہ سماج ہے –عجب بات ہے کہ تنہا کردئے جانے
والوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی روش سے تنہا ہوئے-
اور قتل ہونے پر سچے آدمیوں کے لیے اب یہ بھی
کہہ دیا جاتا ہے کہ

برے کام کا برا انجام

اب بھلا سچ بولتے ہوئے اور اقدار کی حفاظت کرتے
ہوئے مارے جانا ایسے ہی جیسے کوئی اسمگلنک کرتا
-،ڈاکہ ڈالتا مڈ بھیڑہونے سے مارا جائے

آج کے زمانے میں علی شناسی کا مطلب

آخر میں ایک سوال جو میں نے اپنے آپ سے علی
شناسی کے موضوع پر یہ مقالہ تحریر کرتے ہوئے کیا
-تھا اور اب اس کو بھی یہاں درج کرتا جاتا ہوں

سوال یہ ہے کا آج کے زمانے میں علی شناسی کا
مطلب کیا ہے؟کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی میں
آج سے کئی صدیاں پہلے کے امویوں کی مذمت کریں-
ان پر لعنت کریں-اور اس زمانے کے ظالموں اور
استحصال کرنے والوں کے خلاف بولتے رہیں-کیا علی
شناسی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس زمانے کے مظلوموں
کے لیے آہ و بکاء کریں-اور ان مظلوموں کے ساتھ
اظہار یک جہتی کرتیں رہیں-جبکہ جو آج کے ملوک
ہوں-استحصال کرنے والے ہوں-آج کے ظالم ہوں ان
کے بارے میں کوئی بات نہ کریں-نہ تو مزاحمت
کریں-نہ لڑیں-بلکہ مظلوموں کے ساتھ کھڑے نہ ہونے

کے بہانے تراشیں-تو ایسے رویوں کے حامل گروہ یا افراد کو علی شناس کہا جاسکتا ہے؟میرا جواب نفی میں ہے-میرے نزدیک ایسے لوگ علی شناس نہیں بلکہ موقعہ شناس ہیں-اور وہ انگلی کٹاکر شہیدوں میں نام درج کرانا چاہتے ہیں-جبکہ علی شناسی کا مطلب یہ ہے کہ آپ عصر حاضر کے استحصالی کی پہچان کریں اور اس کے خلاف کمربستہ ہوجائیں تبھی ماضی کے علی کرم اللہ وجہہ کے دشمنوں سے آپ کی نفرت معنی رکھے گی اور علی سے آپ کی محبت میں خلوص نظر آئے گا-

اللہم صلی علی محمد وآل محمد

شریعتی اور علی شناسی

ڈاکٹر علی شریعتی اسلام،محمداور علی شناسی کا سب سے بڑا حوالہ ہیں-میں نے انہیں کالج کے زمانے میں

دریافت کیا تھا-سب سے پہلے مرحوم دوست ہما علی تھیں جنہوں نے علی شریعتی کی تقریر"علی ایک دیو مالائی سچ"مجھے پڑھنے کو دی اور میری فکر کی دنیا کو تہہ و بالا کرڈالا-ان کی والدہ کے توسط سے میں "سرخ شیعت و سیاہ شیعت"سے آشنا ہوا-اور پھر یہ ایرانی نژاد طاہر یزدانی تھے جو عاشق شریعتی تھے اور شناور فلسفہ شریعتی بھی جنہوں نے شریعتی کی علمی ایمپائر کی ایک طویل سیر مجھے کرائی تھی-اور ٹھیک طرح سے میں خوشہ چیں علی شریعتی اسی زمانے میں ہوا تھا-

ایک دلچسپ واقعہ یہاں میں اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں-یہ سردیوں کے دن تھے-میں ایک شہر میں ایک معروف شیعہ مدرسہ کے اندر بنے کتاب گھر میں چلا گیا-اور میں نے وہاں انچارج سے پوچھا کہ کیا ان کے پاس ڈاکٹر علی شریعتی کی کتب موجود ہیں؟انچارج نے کہا کہ وہ ڈاکٹر علی شریعتی کی کتب نہیں رکھتے-اس پر میں

نے حیرانی اور تاسف کا اظہار کیا-تو اس انچارج کے ساتھ بیٹھے ایک باریش شخص نے مجھے کہا کہ

"علی شریعتی کو تو ایرانی مدرسوں نے ترک کردکھا ہے-وہ ایک متروک مصنف ہے-تم اپنی توانائی اس راستے پر خرچ مت کرو"

(یہ باریش آدمی اس مدرسے کے مہتم تھے اور بہت بڑے عالم خیال کئے جاتے تھے)

میں ان کی بات سنکر ہنس پڑا اور بے اختیار کہا

"مولوی صاحب!جو آپ کے ہاں متروک ہوجائے وہ عندالناس مقبول ہوجاتا ہے-مجھے خوشی ہے کہ ملّائیت کے ہاں شریعتی متروک ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے وہ علی کا سچا پیرو ہے"

میری یہ بات سنکر اس مولوی کی زبان سے یہ نکل گیا کہ

"کم بخت شریعتی ایک جادوگر ہے جو اس تک پہنچ جائے واپس نہیں آتا-میرے بیٹے اور بیٹی کا حال تم سے مختلف نہیں ہے"

علی شریعتی نے تو ان مولوی صاحب کے گھر میں نقب لگالی تھی اور ان کی اولاد کو مکتب علی شناسی میں داخل کراڈالا تھا-

علی شریعتی کی تحریروں کا کمال یہ تھا کہ وہ آپ کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیتی ہیں اور آپ کو علی سے ملواکر دم لیتی ہین-جو شریعتی کی علمی دنیا کی سیر کرنے جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا ہے-

علی شریعتی ایک آرٹسٹ تھے-ان کا قلم برش تھا-اور کاغذ کینویس-وہ ایسے رنگوں کا انتخاب کرتے جن سے خدوخال واضح اور روشن ہوجاتے تھے-وہ مکتب علی کی تصویر کشی میں مناظر کے تنوع میں وحدت کو گم نہیں کرتے تھے-انہوں نے محمد،خدیجہ،علی،فاطمہ،حسن،حسین اور علی بن حسین کی جن تصویروں کو کینویس پر منتقل کیا وہ ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے-

مجھے ان جیسی طاقتور امیجری کسی اور مذہبی سکالر کے ہاں نظر نہیں آتی-میں نے قائم رہنا،حریت فکر کو حرزجاں بنانا،بے عملی سے نفرت کرنا پہلے

علی شریعتی سے سیکھا-اور پھر ان صفات کا کامل
-نمونہ محمد اور علی میں دیکھا

میں علی شناسی کے باب کو کھولنے کے لیے عرصئہ
دراز سے بے تاب تھا-مگر اس باب تک رسائی نہ
ہوپارہی تھی-بار بار ارادہ کرتا اور بار بار ارادہ توڑتا
تھا-ڈاکٹر علی شریعتی سے تعلق بہت عرصئہ سے تھا-
میری شدید خواہش تھی ڈاکٹر علی شریعتی کی "علی
شناسی"کے باب میں اجتہادی کارناموں کو عوام کے
سامنے لیکر آوں-لیکن ہر بار "ٹھہر جا" کی صدا سنائی
دیتی تھی-ایک مرتبہ مایوس ہوا تو مجھے یوں لگا کہ
شریعتی کے چہرے پر غصّے کی لالی پھیلنے لگی ہو
اور مجھے ان کی طرف سے یہ بات بھی لگا کہ سننے
کو ملی کہ تمہیں جبریت و تقدیر پرستی کے چنگل سے
آزاد کرانے کے لیے علم وعرفان کی وادی کی سیر
-کرانے کا فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا

پھر ایک دن وہ آیا کہ مجھے کہ "علی شناسی"کے
دروازے میرے لیے کھول دئے گئے اور باب شہر
العلم کی بارگاہ میں ازن باریابی مل گیا-اور اسی

راستے پر وہ مقام بھی آگیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا-یعنی شریعتی کی علی شناسی پر مجھے قلم اٹھانے کی توفیق مل گئی اور میرا قلم رواں دواں ہوگیا-میں حیران تھا کہ لفظوں کی جیسے بارش ہورہی تھی اور معانی کا ایک جہان آباد ہورہا تھا-

ڈاکٹر علی شریعتی وہ واحد رہنماء ہیں جنہوں نے مسلم معاشروں کی ثقافتی پسماندگی کا سراغ لگانے میں ایک ایسا ڈسکورس ایجاد کیا کہ اس نے ایرانی سماج کی فکری کایا کلپ کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا-

ڈاکٹر علی شریعتی کے بارے میں ہم ایک بات تو بہت اعتماد اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان دانش وروں میں شامل ہیں جنہوں نے اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ اسلام اور سماجیات کا باہمی کوئی رشتہ نہیں ہے-

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میرے قلم نے علی شناسی پر جو کچھ بھی لکھا اس کے جوہر کے لیے شریعتی کا ڈسکورس میرے کام آتا رہا-میرے نزدیک علی شریعتی بلواسطہ میرے مرشد،میرے استاد

اور میرے گرو ٹھہرتے ہیں-میں اپنی فکر کے بڑے حصّے کو ان سے تعلق کا فیض خیال کرتا ہوں-

حقیقت یہ ہے کہ اسلام،محمد،علی و آئمہ اہل بیت سے شناسائی کا جو علمی ڈسکورس علی شریعتی نے دریافت کیا پہلے کوئی دریافت نہ کرسکا تھا-شریعتی وہ آدمی ہیں جنہوں نے مسلم تاریخ کو فرقہ پرست تعبیرات کے چنگل سے آزاد کیا-انہوں نے اپنے ڈسکورس سے فہم تاریخ کے باب میں ایسا کارنامہ رقم کیا جس کے سبب سماج کا جمود ٹوٹا-اور سماج آگے جانے کے قابل ہوگیا-

ڈاکٹر علی شریعتی نے مذہبی زبان اور استعاروں کو سیاسی،سماجی اور معاشی تبدیلی کے لیے استعمال کیا-کیونکہ ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال تھا کہ مسلم معاشرے جس طرح کی پابندیوں کی زد میں ہیں ان میں مذہبی زبان اور استعارے ہی واحد دستیاب زریعہ ہیں تبدیلی کی راہ ہموار کرنے کے لیے-

ڈاکٹر علی شریعتی کی ساری جدوجہد کا مرکز اور خواہش مسلم معاشروں میں انقلاب برپا کرنا تھا-وہ

مسلم معاشروں کو وحدت و مساوات کا نمونہ بنانا
چاہتے تھے-

ڈاکٹر علی شریعتی کی علمی،فکری اور عملی جدوجہد
کا عمومی مقصد تو مسلم معاشروں میں ایسا انقلاب
برپا کرنا تھا جو وحدت بنی نوع انسان اور عدل کامل
کے اصول کی روشنی میں آئے-اس انقلاب کے
زریعے مسلم معاشروں کی
سیاسی،سماجی،معاشی،مذہبی،فکری پسماندگی ختم
ہوجائے-جبکہ ان کی جدوجہد کا خصوصی مقصد
انقلاب جس کا اوپر زکر ہوا اس کو ایرانی سماج میں
لیکر آنا تھا-

ڈاکٹر علی شریعتی نے دو پی ایچ ڈی کیں تھیں-ایک پی
ایچ ڈی عمرانیات اور دوسری تقابل ادیان میں تھی-ان
کے اکیڈمک بیک گراؤنڈ کو دیکھتے ہوئے یہ سوچا
جاسکتا ہے کہ ان کا مطمع نظر ماہر سماجیات،ماہر
تقابل ادیان کے طور پر شہرت پانا یا کسی یونیورسٹی
کے شعبہ علم و تحقیق میں بیٹھ کر ریسرچ کرنا ہونا
چاہئے تھا-لیکن علی شریعتی نے خود کو عمرانیات،یا

مابعدالطبیعات کے ماہر یا ماہر تاریخ کے طور پر منوانے کی کوشش نہیں کی-بلکہ انہوں نے ایک سچے ،دانا اور صاحب بصیرت گواہ کے طور پر خود کو منوانے کی کوشش کی-

مجھے ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی کا یہ پہلو ان کی شخصیت میں انقلاب و بغاوت و حریت کی تشکیل کرتا ہوا ملتا ہے-علی شریعتی اسی لیے جب رول ماڈل کی تلاش میں اور ایک سچے نمائندہ کی جستجو میں نکلتے ہیں تو وہ پیغمبر محمد،علی،ابو زر ،حجر بن عدی جیسے چہروں کو رول ماڈل قرار دیتے ہیں-وہ ایک فلسفی،شاعر،ادیب،ماہر علم کلام و ماہر تاریخ سمیت ان سب کرداروں کی درباری پن کی قلعی کھولتے ہیں جو علم کے نام پر انقلاب کو فنا کرنے کے درپے تھے-آپ ان کی کتاب"اسلام شناسی"کو پڑھیں-اس کے اندر "چہرہ محمد "والا باب پڑھیں-ان کا ہنر مند کے نام خط ملاحظہ کریں-ابوزر پر ان کا دیباچہ لکھا ہوا دیکھیں-انسان کو قید کرنے فکری

زندانوں پر تنقید کو ملاحظہ کریں آپ میری بات کی تائید کریں گے-

علی شریعتی ایران سمیت مسلم فکری دنیا کے اہم ترین ناموں میں سب سے الگ اور منفرد مقام کے حامل اپنے اسلوب تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ اپنے طرز زندگی کی وجہ سے بھی ہیں-

سوال یہ جنم لیتا ہے کہ انہوں نے یہ طرز عمل کہاں سے مستعار لیا؟میرے نزدیک شریعتی کی کتب کے متون گواہی دیتے ہیں کہ علی نے یہ اسلوب اور طرز حیات امام علی اور خانودہ اہل بیت اطہار سے لیا-

میں کہتا ہوں کہ شریعتی اپنے معاصرین میں اس لیے بازی لے گئے کہ انہوں نے مکتب علی کے صافی سرچشمے کو پھر سے دریافت کیا-اور علی شناسی کی روائت کی نئی آب و تاب کے ساتھ رونمائی کی-

انہوں نے "مکتب علی"کو ایک زندہ فعال اور عمل سے جڑے مکتب کے طور پر پھر سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا-ایرانی سماج سمیت پورے

مسلم دنیا کے سماج میں مذہب کے نام پر تقدیر پرستی اور بے علمی کے مسلک و مکتب سے جان چھڑانے کا عمل آسان نہیں تھا-اس کے لیے علی شریعتی نے دن رات ریاضیتیں کیں-

عام طور پر مغربی محققین اور تجزیہ نگار علی شریعتی کی فکر اور آئیڈیالوجی میں تنوع،پیچیدگی،اور کینویس کے وسعت پر زیادہ نظر کرتے ہیں اور ان کی سوچ پر عدم ربط اور انتشار تک کا الزام عائد کرتے ہیں مگر وہ علی شریعتی کی تحریر میں مغرب و مشرق کے فلسفوں ،مذاھب،تاریخ ،آرٹ کے وسیع حوالوں میں خود کو غرق کر لیتے ہیں-اور اس رنگا رنگی میں پائی جانے والی وحدت تک ان کی نظر نہیں جاتیں-شریعتی کے ہاں سارا تنوع،رنگآ رنگی "علی شناسی"پر آکر جمع ہوجاتی ہے-

علی شریعتی کے ہاں علی شناسی کا مطلب اسلام شناسی،محمد شناسی،سماج شناسی،آدم شناسی،خدا شناسی ہے-انہوں نے علی شناسی کو فرقہ واریت کی جڑیں مضبوط کرنے والی علمی روائت بنانے کی

بجائے اس کو نہ صرف مسلمانوں میں وحدت فکر و
عمل کا سرچشمہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ
اس کو سارے انسانوں کے درمیان وحدت پیدا کرنے کا
زریعہ بنانے کی کوشش کی-اور "مکتب علی"کو جمود
سے نکال کر اسے ایک متحرک آئیڈیالوجی میں بدلنے
-کی کوشش کی

ڈاکٹر علی شریعتی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں
نے "مذہب کا ایسا ڈسکورس دریافت کرنے کی کوشش
کی جس میں "خارج"کرنے کی بنیاد کو مابعدالطبیعاتی
ایسے ستونوں پر کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی
تھی جس میں عمرانی بنیادوں کی گنجائش نہ ہو-اور
نجات انسانی کا کوئی زمیی تصور بھی موجود نہ ہو-
میرےلیے علی شریعتی کا یہ کارنامہ بہت اہم تھا-انہوں
نے آزادی کے ساتھ شیعی فکر،اہل تسنن کے
نظریات،مغربی وجودیت،صوفیاء کی رمزیت
پسندی،جدلیاتی اشتراکیت،سامراج اور سامراجیت کو
گہرائی میں جانچا اور اس جانچ کرنے کے بعد انہوں
-نے "علی شناسی"کے باب میں نئی نئی دریافت کیں

یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ شریعتی نے جدیدیت و قدیمیت کے دو رواں دریاؤں کو جس طرح سے دیکھا ویسے دیکھنے کی توفیق بہت کم دانشوروں کو ملی-

میرے خیال میں ڈاکٹر علی شریعتی کا یہ کارنامہ تھا کہ انہوں نے بہت جلد یہ اندازا لگالیا تھا کہ ایرانی سماج بالخصوص اور مسلم معاشرے باالخصوص داخلی اور خارجی دونوں طرح کے جبر کے شکار ہیں-داخلی جبر ان معاشروں کے اندر مذھب و رواج اور حکمران طبقے کی مفاد پرستی سے ایک ثقافت بنکر ابھرتا ہے تو خارجی جبر اس سرمایہ دارانہ مغربی نوآبادیاتی ثقافت سے نمودار ہوتا ہے جو جدید ترقی یافتہ دنیا میں غالب ہے-علی شریعتی ان ہر دو جبر کو دریافت کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ ان دو جبر کی وجہ سے مکتب علی کی حقیقت اور جوہر ایرانی سماج سمیت مسلم سماج پر آشکار نہ ہوسکا اور انہوں نے تو یہ بھی کہا کہ "ایرانی سماج داخلی و خارجی جبر کے سبب علی کو پہچان نہ سکا"

شریعتی کے خیال میں "علی شناسی "ایک انقلابی آئیڈیا
لوجی سے آشنا ہونے کا نام ہے-اور انقلابی آئیڈیالوجی
-وہ مکتب علی کے اندر پنہاں دیکھتے ہیں

علی شریعتی کے خیال میں ایسی آئیڈیالوجی جو
معاشرے کو متحرک کرسکے وہ "اسلام "ہے اور اس
کو شریعتی "سرخ تشیع کے نام سے پکارتا ہے-ان کے
خیال میں علی کی آئیڈیالوجی(جسے وہ کبھی
براہیمی،کبھی موسوی،کبھی محمدی تو کبھی
قرانی،کبھی سرخ تشیع تو کبھی ہابیلی آئیڈیالوجی تو
کبھی حسینی آئیڈیالوجی کہتے ہیں)تقدیر پرستی اور
جبریت کے بتوں کو پاش پاش کرسکتی ہے-اور ان کی
-جگہ وحدت و مساوات کے یوٹوپیا کو لیکر آسکتی ہے

ان کے خیال میں "علوی آئیڈیالوجی"کے اندر یہ
صلاحیت موجود ہے کہ وہ سماج کے اندر جدلیاتی تناؤ
کو پیدا کرے-اور اس تناؤ کا منطقی انجام جبر اور
اختیار کی حامی قوتوں میں کشاکش کی صورت نکلے
-اور جبر کی قوتیں اپنے انجام کو پہنچ جائیں

ڈاکٹر علی شریعتی نے ایک جگہ اس خیال کو یوں بیان کیا

آئیڈیالوجی "امام کا عقیدہ ہے-اور وہ اس کو خارجی" حقائق سے جوڑتا ہے-اس سے جو حقیقت بنتی ہے اس کی روشنی میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ کون سی اقدار خارجی حقائق میں پائیدار ہیں اور ان کو بطور آئیڈیل "متعارف کرایا جاسکتا ہے

علی شریعتی نے تاریخ اسلام کا گہرائی میں جاکر مطالعہ کیا اور پوری زمہ داری کے ساتھ معروضی بنیادوں پر تعصبات سے پرے ہوکر تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "علوی اسلام"نے ایک ایسی آئیڈیالوجی کا کردار ادا کیا جس نے جبر،محکومیت کے خلاف جدوجہد اور ناقابل برداشت حالات کو بدلنے کے لیے امید پرستی کو عام کیا-جب جب عوام نے علوی اسلام کو بطور ایک آئیڈیالوجی،بطور ایک آدرش کے اپنایا تو یہ ایسی قوت فراہم کرنے والی آئیڈیالوجی ثابت ہوئی جس نے بڑے بڑے جابروں اور ظالم -حکومتوں کو ہلاکررکھ دیا

علی شریعتی نے اس سوال پر بہت غور و فکر کیا کہ "علوی اسلام "کے رھبر،پیرو زبردست جبر اور دباؤ کا نشانہ کیوں بنے؟آخر "علوی اسلام "کو مسخ کرنے پر سارا زور حاکم طبقات نے صرف کیوں کئے رکھا؟

علی شریعتی نے اس کا جواب کچھ یوں دیا

علی شناسی "کا مطلب آزاد شعور کا انتخاب ہے-اس" آزاد شعور کے ساتھ ایسی آئیڈیالوجی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنا ہے جو سماج کے اندر موجود ثقافت کے توانا اور تخلیقی عناصر سے خود کو ہم آہنگ کرے "اور پھر سٹیٹس کو بدلنے کے لیے جدوجہد کرے

علی شریعتی نے غور وفکر کی ساری صلاحیتیں اور گیان و دھیان کی ساری حسوں کو "انقلابی آئیڈیالوجی"کی تلاش میں لگائے رکھا-اور پھر یہ نتیجہ سب کے سامنے پیش کیا کہ

ہر انقلابی نظریہ ساز آپنے آدرش ،نصب العین"کے" مطابق سٹیٹس کو کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے-اسی لیے انقلابی نظریہ ساز مزاحمت کار کہلاتا ہے-وہ فعال

کردار کا مالک ہوا کرتا ہے-اور اس طرح کا کامل انقلابی "رسول "ہوتا ہے-اور بعد از رسول اس طرح کا "کامل نمونہ علی کی زات تھی

گویا علی شریعتی کے نزدیک علی "بنو ہاشم "و بنو امیہ کی باہمی چتقلش کےایک فریق نہ تھے بلکہ وہ ایک انقلابی آئیڈیالوجی کے حامل مزاحمت کار سٹیٹس -کو کو توڑنے کے علمبردار تھے

علی شریعتی نے ایرانی سماج میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایران کی عوام کو مذہبی بلعم باعوروں نے انفعالیت کی پوجا کرنے پر لگا رکھا ہے-اور ان کو سوائے کراہنے،آہ و فغاں کرنے ،رونے دھونے اور اپنی تکلیفوں کو خدا کی مرضی سمجھنے والی مذہبی تعبیر کے کسی اور طرف دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے-علی شریعتی کو وقت کے ساتھ ساتھ یہ اندازا ہوتا چلا گیا کہ یہ صورت حال صرف ایران کی نہیں ہے بلکہ یہ تو مسلم معاشروں کی عمومی صورت حال ہے-ایسے میں علی شریعتی نے "علوی اسلام"کی انقلابی بنیادیں دریافت کرنے اور اس ک لوگوں کے سامنے

پیش کرنے کا بیڑا اٹھا لیا-اور حالات کا انقلابی آئیڈیالوجی کی روشنی میں جائزہ لینے کا فیصلہ کیا-اس نے "علوی اسلام "کی انقلابی بنیادیں استوار کیں-اور ثابت کیا کہ "علی شناسی"وہ راستہ ہے جس سے تبدیلی کا راستہ ہموار ہوسکتا ہے-اور مسلم معاشروں کی صدیوں کی پسماندگی کی دیوارایک چھلانگ میں پھلانگی جاسکتی ہے-

علی شریعتی نے اس بات کی تحقیق کی کہ "محمد،علی،حسن،حسین،ابوزر"جیسے لوگ کیوں نابغہ ہیں؟اور ان کے راستے کی پیروی کا مطلب کیا ہے؟کیا ان سے شناسائی و معرفت کا کوئی عمرانی مطلب بھی بنتاآ ہے؟ان سوالوں کا جواب تلاشتے ہوئے شریعتی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان جیسے نابغہ لوگوں کی پیروی ترک کرنے کا مطلب ان کے تصور عدل و مساوات سے انحراف تھا اور اس انحراف نے ظلم اور جبر کو مذہبی جواز فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور مسلم معاشرے زوال پذیر ہوگئے-منصفانہ معاشرے

کے قیام کی راہ میں روکاوٹ علوی اسلام سے روگردانی کی صورت پیدا ہوئی-

علی شریعتی کہتے ہیں کہ جب مسلم سماج نے بنو امیہ کے ملوکانہ و ظالمانہ نظام کے خلاف "علوی ڈسکورس"کی پیروی نہ کی اور صوفیانہ رمزیت،ترک دنیا،نام نہاد غیرجانبداری کا ڈسکورس اپنا لیا تو سماجی انقلاب کا راستہ بھی بندہوگیا-ظلم اور جبر نے معاشرے کو اپنی گرفت میں لیا سو لیا بلکہ علم اور دانش کا تبدیلی سے رشتہ کٹ گیا-شریعتی ایک جگہ اس بات کو مامون کی "علم پسندی اور فلسفے کی ترقی و ترویج اور علوم کے عربی تراجم"کی تحریک کو انقلابی علم کو ختم کرنے کی تحریک سے تعبیر کرتے ہیں اور علوی اسلام کو نابود کرنے کی سازش کہتے ہیں-علی شریعتی کے خیال میں "علوی فکر "باعمل انقلابی دانشور "پیدا کررہی تھی جو عوام کو تبدیلی کے لیے تیار کرتے تھے اور دربار سے وابستہ ہونے سے روکتے تھے-اس لیے عباسیوں نے اور اس سے پہلے امویوں نے بے عمل عالموں اور جبریت کے

پیروکاروں اور صرف ذہنی عیاشی سے سروکار رکھنے والوں کا دربار سجایا-علی شریعتی کی نظر میں مسلم سماج کا ثقافتی اظہار علوی اسلام کی شکل میں تھا-اس علوی اسلام کی بے عمل تعبیر نے مسلم معاشروں کو پسماندگی،غلامی کے اندھیروں میں دھکیلنے میں اہم کردار ادا کیا-اس لیے علی شریعتی کا کہنا تھا کہ اسلام کے ثقافتی اظہار کو مسلم معاشروں میں فکر مرتضوی سے روشن کرنا اشد ضروری ہے-اس کو اس تعبیر کی جانب لوٹانا ہے جو سٹیٹس کو توڑنے کی دعوت دینے والی ہو-ان کے خیال میں فکر علی کی روشنی میں اسلام کا ثقافتی اظہار عالمگیریت سے روشناس ہوسکتا ہے-

ڈاکٹر علی شریعتی کو بارگاہ علی میں اذن باریابی ملا-اور ان کو مکتب علی کے اندر داخلہ ملا-اس مکتب کے اندر تحصیل علم کرتے ہوئے ان پر یہ انکشاف ہوا کہ اسلام کی انقلابی آئیڈیالوجی ہونے کا مطلب کیا ہے-اور اس مکتب میں امام علی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے انہوں نے یہ راز پالیا کہ اسلام بطور

ایک انقلابی آئیڈیالوجی کے اپنے ظہور کے وقت سے مظلوموں کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے-اور یہ کہ تمام انبیاء بشمول محمد سماجی برابری کے لیے لڑتے رہے-علی بھی اسی خاطر لڑے-انہوں نے محرومی کا شکار معاشرہ پایا تھا-اسلام غریب کے ق میں ہے اور وہ غریبوں کے کیمپ میں ہے-علی شریعتی نے مکتب علی کے اندر یہ لازوال نکتہ دریافت کیا تھا کہ

اسلام بطور انقلابی آئیڈیالوجی کے یہ انکشاف کرتا" ہے کہ اللہ کی ذات مظلوموں اور محکوموں کے ساتھ ہے-خدا مظلوموں،استحصال زدوں اور محکوموں اور "کمزروں کا خدا ہے

علی شریعتی کے بارے میں جب میں نے تحقیق شروع کی تو دوران سفر تحقیق مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے "قران،محمد،علی اور اسلام شناسی" کا "جدید بیانیہ"دریافت کیا-انہوں نے "جوہر مکتب علی"کو عضر حاضر کے تناظر میں ڈھالا-اور اس عمل کو -انہوں نے "ریفارمیشن آف اسلام"سے تعبیر کیا

انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ

"اسلام کو ویسے ہی ریفارمیشن کی ضرورت ہے
جیسے یورپ میں مسیحی مذہب کو پڑی تھی"

انہوں نے ایک جگہ اور لکھا

"ایرانی سماج تاریخ کے اس مرحلے میں ہے جس
مرحلے پر 14ویں صدی کا یورپ تھا-جب اس نے
صدیوں کے جمود کو ریفارمیشن کی مدد سے توڑ ڈالا
تھا-پروٹسٹنٹ ریفارمیشن نے یورپی سماج کو جدیدیت
کی جانب چھلانگ لگانے میں مدد کی تھی"

انہوں نے مزید کہا

"اسلامی سماج کو ایسی مذہبی ریفارمیشن کی
ضرورت ہے جو تقدیر پرستی،سٹیٹس کو کو باقی
رکھنے والی روش سے ہٹانے میں مددگار ہو-اور
مسائل کا حل دینے والی آئیڈیالوجی کے جنم کی راہ
ہموار کرے"

علی شریعتی نے لکھا

"آج ہمارے لی مارٹن لوتھر اور کالون کا کام اہم ہے-
کیونکہ انہوں نے کیتھولک مکتب کی جامد اخلاقیات
کو متحرک تخلیقی قوت میں بدلنے کا کام کیا"

علی شریعتی کے خیال میں ایسی مذہبی ریفارمیشن
عظیم توانائی کی حامل ہوگی-مسلم معاشروے اس قابل
ہوں گے کہ وہ انقلابی جست لگائیں اور صدیوں کا سفر
پل میں طے کرلیں-اور ترقی کے اعتبار سے مسلم
معاشرے بھی مغربی معاشروں کی سطح تک پہنچ
جائیں گے-

علی شریعتی نے مغربی جدیدت سے متاثر ہوکر یکسر
الحادی طریق سے جدیدیت پھیلانے کی کوششوں کا
کامیاب تنقیدی جائزہ لیا-ان کے خیال میں مذہب کے نام
پر پسماندگی اور جہالت کے غلبے کی زمہ داری ان
لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے الحادیت کو
جدیدیت سے لازم کرڈالا-ان کے خیال میں مسلم
معاشروں میں "اسلام "ایک غالب ثقافت،روائت اور
شناخت کے طور پر کارفرماء ہے-اس لیے یہاں تبدیلی
کا بیانیہ اس سے مطابقت رکھنے والا ہو-انہوں نے

ایرانی سماج میں 20ویں صدی کے یوروپی سیکولر ماڈل کے نفاذ کی کوشش کو کار لاحاصل کہا-لیکن ان کے خیال میں اسلام بطور ایک ثقافتی،روایتی اور شناختی روح کے مسلم سماج کی ترقی کی راہ تبھی ہموار کرسکے گا جب تک اس کو ریفارمیشن کے عمل سے گزارا نہ جائے-ریفارمڈ اسلام ایک آئیڈیالوجی کے طور پر عوام کو سیاسی،معاشی اور ثقافتی جبر کے خلاف جدوجہد پر آمادہ اور متحرک کرنے والا ثابت ہوسکے گا-

شریعتی نے جب "شیعی اسلام"کی تاریخی جڑوں کا مطالعہ کرنے کا رخ کیا اور متون ہائے کتب شیعہ کو پرکھا تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ کیسے ایک زندہ و متحرک انقلابی مکتب فکر جامد،مردہ اور جبر کو روا رکھنے والی آئیڈیالوجی میں بدل دیا گیا-وہ فکر جو ایک سیاسی،معاشی،سماجی اور ثقافتی آئیڈیل یا آدرش کے طور پر سامنے آئی وہ کھوکھلی رسمیت پسندی میں بدل دی گئی-علی شریعتی کا خیال تھا کہ تاریخ کا ویل رجعتی انداز میں ایسے گھمایا گیا کہ توحیدی

مذھب کے لبادے میں فرعونیت،قارونیت اور بلعم
باعوریت نے قبضہ جمالیا-کتنی عجیب بات ہے آزادی
و اختیار کا سب سے بڑا علمبردار جبریت اور
تقدیرپرستی کے چنگل میں پھنس گیا-چراغ مصطفوی
ابو لہب کے ہاتھ آگیا-اور علی کے مسلک پر اموی
چہروں نے قبضہ جمالیا-اس لیے شریعتی ریفارمیشن
کے عمل کو جلدی شروع کرنے کا کہتے ہیں-اسلام کو
وہ پھر سے مسائل کا حل بتانے والی آئیڈیالوجی میں
-بدلنے کی بات کرتے ہیں

ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام میں
توحید،رسالت،عدل،امامت،آخرت جیسے اصولوں کی
عمرانی بنیادیں تلاش کیں-ان اصولوں کو سماجی تبدیلی
-کا محرک اول ثابت کرنے یے لیے انتھک محنت کی

ڈاکٹر علی شریعتی نے مکتب علی کی جڑوں کی تلاش
کے دوران علی کی وساطت سے قران سے ربط پیدا
کیا اور اس کتاب کو کتاب انقلاب کے طور پر پالیا-اور
ایک دن وہ آیا جب شریعتی نے واشگاف الفاظ میں
اعلان کیا

قران سماجی انقلاب کا مرکزی کردار "الناس" یعنی" "عوام کو سونپتا ہے

شریعتی نے فکر علی سے یہ بات اخذ کی کہ

عوام(الناس)اجتماعی طور پر خدا کی نمائندگی کرتے" ہیں-قران خدا اور عوام کو سماجی معاملات میں ایک "قرار دیتا ہے

شریعتی نے "امامت"کے اصول کو سماج میں تبیلی کی طرف لیجانے اور عوام کا انقلابی کردار بنانے میں اہم قرار دیا اور کہا کہ یہ اصول خود آگاہ،باشعور،روشن فکر دانشوروں کی موجودگی کو ممکن بناتا ہے-جو -انقلاب میں عمل انگیز کا کردار ادا کرتے ہیں

علی شریعتی کے خیال میں مکتب اہل بیت میں روشن فکر دانشور جنم لیتے ہیں-اور وہ تبدیلی کا راستہ ہموار کرتے ہیں-ان کے بنا کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے-ان کے خیال میں انقلابی دانشوروں کی وجہ سے عوام تیزی سے تبدیلی کے حامی بنتے ہیں-یہ دانش ور عوام کے اندر ظلم،جبر،پسماندگی اور محکومیت کے خلاف

نفرت کو بغاوت میں بدلتے ہیں-ان کے خوف کو ختم کرتے ہیں-اور ایک عمل انگیزی کا کام سرانجام دیتے ہیں-

"جب سماج روشن فکر دانش وروں سے زندگی پاتے لگتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جب سماج ایک لمبی تخلیقی انقلابی جست لگاتا ہے-اور صدیوں کی پسماندگی دور چلی جاتی ہے-اگر جست نہ لگے تو تاریخی جبریت کا انتظار کرنا پڑتا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ علی شریعتی نے ایک مفکر،روشن فکر دانشور یا رہبر کا ماڈل شعوری یا غیرشعوری طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شکل میں لیا-وہ علی کو مرکز اس کے گرد اور بھی انقلابی روشن فکر اہل دانش کو نمایاں کرتے ہیں-جیسے ابوزر کہ چہرہ،حجر ابن عدی کا چہرہ،وہ کہتے ہیں

"روشن فکر دانشور مسلم سماج میں اپنی فکر پر اتنا یقین رکھتے ہیں کہ اس کی خاطر جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے-بے خبر عوام کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں-وہ معاشرے کا حقیقی ایشو اس کی

پسماندگی بتلاتے ہیں اور اس کو دور کرنے کے لیے
اسلام کو بطور مذہب انصاف و مساوات کے طور پر
"دریافت کرتے ہیں

علی شریعتی جب ایسا کہتے ہیں تو ان کے دماغ میں
علی اور دیگر اہل بیت کا کردار گردش کرہا ہوتا ہے-
علی شریعتی ایسے دانشور فقط مسلمانوں میں ہونے کا
اعتقاد نہیں رکھتے بلکہ وہ ان کے ہر مذہب و ملت
-میں پائے جانے کی بات کرتے ہیں

علی شریعتی "مکتب اہل بیت"کی انقلابیت کو
اشتراکیت،شیعی تاریخ،صوفی باطنیت،مغربی وجودیت
کے تنقیدی جائزے کے دوران دریافت کرتے ہیں-اور
اسی دوران وہ نہج البلاغہ،قران،سیرت محمدی کی
انقلابیت کو دریافت کرتے ہوئے علی شناسی کی بنیاد
اول توحید اور اس کے عمرانی ربط کو بھی تلاشتے
ہیں-اور بطور طالب علم مکتب علی توحید کو علوی
آئیڈیالوجی کی بنیادقرار دیتے ہیں-وہ توحید کو ایک
کلامی یا تجریدی تصور کی بجائے ایسے تصور کے
طور پر دیکھتے ہیں جس میں کائنات ایک نامیہ کے

طور پر ہوتی ہے-زندہ نامیہ-جو خود آگاہ بھی ہے-ایک
-نصب العین کے جانب بڑھ بھی رہی ہے

ایسی توحید جو خدا،کائنات اور فطرت کی وحدت پر
مبنی ہے-علی شریعتی حقیقت کی ظاہری شکل میں
منتشر دکھائی دینے سے دھوکا نہیں کھاتے-کیونکہ
توحید کی رو سے کائنات ایک ہم آہنگ کل ہے-انسان
کا فرض اس کلی وحدت کی معرفت ہے-اس وحدت کو
-قبول کرتے ہوئے اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنا ہے

علی شریعتی دنیا میں بے ربطگی،انتشار ،بے سمتی کو
توحید کے اندر انتشار کی علامت خیال نہیں کرتے
بلکہ ان کے نزدیک یہ بےسمتی اور انتشار اصل میں
-شرک کے تصور کے تسلط کی وجہ سے ہے

شرک دنیا پر ان لوگوں کا مسلط کردہ تصور ہے جو"
توحید کے انکاری ہیں-یہ بت پرستانہ طرزفکر ہے جو
متضاد و متصادم قوتوں کے خالق ہونے کا عقیدہ رکھتا
ہے-تاریخ توحید اور شرک کے درمیان ابتداء سے
"تصادم کی تاریخ ہے

"شرک-نظم ہے خدائی کا چیزوں-ہے فطرت توحید
فطرت اور نظم خداوندی کا دشمن ہے-اس لیے اس کا
خاتمہ ضروری ہے-توحید کا مطلب خدا کے آگے
"جھکنا اور تمام غیراللہ سے بغاوت کرنا ہے

علی شریعتی نے جب مسلم تصور توحید بارے اب تک
ہونے والی علمی تحقیق اور اس کے مسلم سماج پر
ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا تو ان کے سامنے یہ
حقیقت آئی کہ ایک زمانہ تک توحید کو ایک کلامی
تنازعہ کی شکل دے دی گئی اور اس کو فعال زندہ
نامیہ کے طور پر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی
گئی-علی شریعتی کے زمانے میں "توحید"کے بارے
میں جو بھی بات ہورہی تھی وہ فرقہ وارانہ شکل کی
تھی-ابن تیمیہ کی فکر سے مستعار سعودی عرب کے
مذہبی پیشواؤں کا طرز اور اس کے رد عمل میں اہل
تسنن اور اہل تشیع کے قدامت پرستوں کی کلامی نکتہ
طرازی تھی جس کی وجہ سے توحید کی فعالیت اور
اس تصور کے عمرانی زندگی سے رشتے و ناطے
ذہنوں محو ہوگئے تھے-ایسے میں یہ علی شریعتی کی

ذات تھی جنہوں نے توحید کے بارے میں انقلابی
طرزعمل اختیار کیا-اور انہوں نے مکتب علی میں اس
عقیدے کی ابتدائی جڑوں کی تلاش شروع کی-علی
شریعتی نے جب تصور توحید کی عمرانی جڑوں پر
کام شروع کیا اور اپنے نتائج عوام کے سامنے رکھے
تو اس پر سب سے زیادہ ردعمل اہل تشیع کے مولویوں
اور نام نہاد مجتہدوں کا آیا-ان کا مکتب علی سے تعلق
مشکوک ٹھہرادیا گیا-اور جب ان کی تحقیق کے ثمرات
پوری طرح سے سامنے آئے تو بہت سے ایسے مولوی
جو خود کو انقلابی کہلواتے تھے وہ بھی اپنی پیشوائیت
کو خطرے میں دیکھنے لگے اور علی شریعتی پر
الزامات کی بوچھاڑ کرڈالی-لیکن علی شریعتی نے اس
یلغار اور حملے سے ہمت نہیں ہاری-انہوں نے "علی
شناسی "کے باب میں "توحید "اور "عدل"کے باہمی
رشتوں کی دریافت اور ان دونوں تصورات بارے "فہم
علی و آئمہ اہل بیت اطہار"کو پوری طاقت و قوت کے
ساتھ بیان کرنے کا سلسلہ جاری رکھا-اور ایران کے
-نوجوانوں کی حمائت حاصل کرنے میں کامیاب رہے

میں نے علی شریعتی کے تصور توحید کی جڑیں فکر علی میں تلاش کیں-اور یہ پایا کہ شریعتی "علی کی فکر توحید"کے سب سے بڑے شناور تھے-علی ایک بے خوف،نڈر اور بےباک انسان تھے-اس لیے کہ توحید نے ان کے سارے خوف ختم کرڈالے تھے-وہ ایک قبلہ اور جہت سے وابستہ ہوگئے تھے تو بے سمتی سے بچ گئے تھے-علی کرم اللہ وجہہ الکریم ایک سرچشمہ فیض سے مستفید ہونے لگے تھے-

علی کے ہاں توحید ایک تجریدی و جامد کلامی مسئلہ نہیں ہے-اور یہی نکتہ علی سے شریعتی نے سیکھا تو توحید انقلاب کی ڈاکٹرائن میں بدل گئی-انسان ایک مرکز کے گرد گھومنے لگا-اسی لیے توحید کے بطن سے سماجی انقلاب،تصور وحدت بنی نوع انسان اور عالمگیر مساوات کا تصور برآمد ہوا-

آپ نہج البلاغہ کا مطالعہ کریں اور علی کے خدا بارے اور انسان و کائنات بارے تصورات کی کھوج کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علی کا تصور توحید جہاں سماجی تبدیلی کے تصور کو جنم دیتا ہے وہیں پر یہ اللہ سے

انسان کا محبت و عشق کے رشتے کی دریافت بھی کرتا ہے-اور اللہ اور بندے کے درمیان عشق و محبت کے ربط کو بھی سامنے لیکر آتا ہے-علی شریعتی اسی بات کو آگے بڑھاکر کہتے ہیں کہ ایک موحد انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ محب و عاشق بھی ہوا کرتا ہے-وہ اپنے رب کے گرد طواف کرتا ہے-جسطرح شمع کے گرد پروانہ رقص کرتا ہے-اور اس آگ کا حصّہ بن جاتا ہے-ایسے ہی موحد عاشق اپنے رب کا طواف کرتا ہے اور اس میں گم ہوجاتا ہے-

علی شریعتی کہتے ہیں

"توحید کا اثبات عشق کو جنم دیتا ہے-اور یہ عشق خدائی قوت بنکر موحد کے رگ و پے میں سرائت کرجاتا ہے-یہ دوسروں کے لیے خود کو قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے-دوسروں کی خدمت کے لیے اپنی نفی کرتا ہے-اور دوسروں کے لیے اپنے آپ سے بغاوت کرتا ہے-ایک موحد کی محب اور عشق کا مطلب بس اللہ کا ہوجانا ہے"

"عشق توکل کو جنم دیتا ہے-جس میں موحد ہاجرہ کی
طرح اپنے آپ کو اللہ کو سونپ دیتا ہے-اور اپنے بیٹے
کو بے آب و گیاہ وادی کی جانب لیجانے پر آمادہ
کرنے کا حوصلہ پاتا ہے"

علی شریعتی اسی لیے سفر حج کو سفر توحید بھی
قرار دیتے ہیں-ان کے خیال میں حج اللہ کی طرف
مراجعت کا نام ہے-ان کا خیال ہے کہ

"ایک موحد حاجی ایک عاشق ہوتا ہے جو اپنے اندر
ایک سفر کرتا ہے-گناہ کی وادی میں جلاوطنی کاٹنے
والا خدا کی جانب لوٹتا ہے-یہ خدا اس کا دوست بھی
ہے-اس کی پناہ گاہ بھی-مکّہ کی جانب سفر "خیر" کی
جانب سفر ہے اور شر سے دوری کی علامت ہے"

"موحد کا حج فجور سے نیکی،نفس سے زات خدا کی
طرف سفر کا نام ہے-اس سفر کے دوران انسان خدا
کے ساتھ ہونے کا تجربہ کرتا ہے-انسان زمان ومکان
کی بندشوں سے یک گونہ اوپر اٹھ کر لازمانیاور
لامکانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے-"

"موحد جب لامکانی و لازمانی کیفیات میں ڈوبتا ہے تو
یہاں سے وہ اکتساب کی منزل سے آگے معرفت کی
منزل تک آجاتا ہے-محبت و عقیدت معرفت میں بدل
جاتی ہے-وجدان کا ظہور ہوتا ہے-دریائے محبت میں
غوطہ زن ہونے کا مقام آجاتا ہے-"

علی شریعتی کے ہاں یہ مقام مسیحائی ہے-اور علی
شریعتی کہتے ہیں کہ اس مقام کا حامل سماج ہی انقلاب
کی جانب سفر کرسکتا ہے-بہت سے ناقدین علی
شریعتی ان کے تصور توحید پر بات کرتے ہوئے اس
پہلو کو نظر انداز کرجاتے ہیں-

علی شریعتی وہ آدمی تھے جنھوں نے مکتب علی میں
علامت نگاری کی اہمیت کو پھر سے دریافت کیا-اور
یہ دکھایا کہ کیسے علی و آئمہ اہل بیت نے قران کی
علامت نگاری کے اعجاز اور وصف کو کبھی اوجھل
نہیں ہونے دیا-اس مکتب نے قران کی علامتی زبان کی
حفاظت کی-اس کے ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ اس
میں پنہاں معانی کو بھی برقرار رکھا-اس لیے شریعتی
کے نزدیک قران کثرت معانی،مفاہیم اور درجہ بندی

کے مختلف پیرائیوں کی وجہ سے ہر زمان ومکان میں فعال نظر آتا ہے-اس لیے شریعتی قران کو حرز جاں بنالینے پر اصرار کرتے ہیں-

علی شریعتی کے نزدیک اسلام کے اندر اصلاح پسندی کی بنیاد قران کی علامتی زبان کی مدد سے رکھی جاسکتی ہے-وہ اپنے استاد مکرم باب شہر علم کی انگلی پکڑکر قران کی علامتی زبان کا بھید جاننے کی کوشش کرتے ہیں-اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ فکر علی کی مدد سے قران کی صحبت میں بیٹھتے ہیں اور علامتی زبان کی گھتیاں سلجھانے لگتے ہیں تو ان پر یہ راز افشاں ہوتا ہے کہ حقیقت ابعاد ثلاثہ کی حامل ہوا کرتی ہے-اور اس کا ایک بعد یا جہت انسان بھی ہے-

علی شریعتی پہلے مفکر تھے جنہوں نے یہ بیان کیا کہ

انسان ایک جدلیاتی حقیقت ہے-یہ حقیقت روح اور" نفس کی ثنویت پر مشتمل ہے-یہ ثنویت انسان کے اندر ایک تضاد کی صورت موجود ہے-اور اس کی جدلیاتی حرکت کا سبب بھی ہے-نفس مادیت و جمود کی علامت

اور روح و روحانیت تحرک کی علامت-انسان کی فطرت دو متضاد قطب سے ملکر بنی ہے-یہ دو متضاد قطب کا اشتراک ارتقائی حرکت کو جنم دیتا ہے-اور یہ "ارتقائی جرکت تکمیل انسان میں معاونت کرتی ہے

اسی تناظر میں علی شریعتی شیطان اور شر کے تصور پر بھی بات کرتے ہیں

شیطان کی خدا کے خلاف جنگ فطرت وخارج کی" بجائے انسان کے باطن میں ہوا کرتی ہے-اور انسان فجور اور شر ابلیس کی معاونت کرتا ہے-اس کے "تصور تقوی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے

قران شریعتی کی نظر میں فجور،شیطینت،ابلیسیت اور نفس بد کے خلاف انسان کو خدائی بصیرت ،خدائی سماعت،خدائی جوہر اور روحانی فطرت سے آراستہ کرنے کی نوید سناتا ہے-یہ وہ کمالات ہیں جو عظمت انسان،تکریم آدمیت،آختیار و آزادی ارداہ کو جنم دیتے ہیں-ان اوصاف کی بنیاد پر انسان ساری مخلوق سے افضل ٹھہرتا ہے-اس کی روحانی فطرت کی نمو ہوتی

ہے-اسی بنیاد پر وہ خلیفہ بنتا ہے-اور امانت خداوندی
کا بار اٹھانے کے قابل ہوجاتا ہے-

علی شریعتی کہتے ہیں کہ

امانت خداوندی کا بوجھ ہی انسان کو زمین پر"
جلاوطنی کے زمانے میں اور ہجرت کے وقت یہیں
زمین پر جنت کا اہل بناتا ہے-انسان خدائی صفات کا
مظہر ٹھہر جاتا ہے-خدا کا دوست اور معتمد بنتا ہے"

اس لیے علی شریعتی تصور عبد کی انقلاب آفرین
تشریح کرتے ہیں کہ

عبد ہونے کا مطلب رعیت ہونا نہیں ہے-بلکہ کمال"
عبودیت خدا کا معتمد ہوجاتا ہے"

شریعتی کس ہاں اسلام انسان کے اندر ثنویت کے
درمیان توازن پیدا کرنے،تشکیک سے یقین کی طرف
جانے اور تضاد سے ہم آہنگي کی طرف لیجانے کا نام
ہے-شریعتی نے واضح کیا کہ انسان مکتب علی کی
نظر میں ماحول کی پیداوار نہیں ہے-بلکہ انسان
شریعتی کے ہاں دانا و بینا اور مثل آرٹسٹ ہے-جو اس

معاشرے کی نوک پلک سب درست کرتا ہے-اس لیے
شریعتی کا مثالی آدمی فلسفی،صوفی،سپاہی،سیاستدان
سب ہی ہوتا ہے-

"انسان کامل کے ہاتھ میں سیزر کی تلوار،سینے میں
دل عیسی ابن مریم،سر میں دانش سقراط،اور حلاج کی
طرح عشق کی مستی میں مگن ہوتا ہے"

ایسی تصویر جو شریعتی نے انسان کامل کی کھینچی
تو محمد کے بعد علی کی نظر آتی ہے-شرف انسانیت
کی معراج پر محمد کے بعد علی کھڑے نظر آتے ہیں-

ڈاکٹر علی شریعتی کی نظر میں "علی شناسی" ایک ایسا
دائرہ ہے جس کے اندر آنے والے انسان محبت کے
جذبے میں سرشار توفیق خدا سے نئے انسان تخلیق
کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں-

علی شناسی کا مطلب شریعتی کے ہاں سماجی انقلاب
ہے-انسان کی کلیت کا ظہور ہے-ذاتی انا کو انسانیت
کی ابدی شناخت میں گم اور جذب کرنے کا نام ہے-

انسان کی انفرادیت اور انسان کی حقیقت کو مکتب علی کی روشنی میں تلاش کرنے کے بعد علی شریعتی نے سماج کی اجتماعیت پر نظر کی-اور سماج کی طبقاتی بنیاد کو شناخت کیا-علی شریعتی ان دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے مسلم سماج کے طبقاتی سماج ہونے کو مشیت خداوندی تسلیم کرنے سے انکار کیا-وہ ان مفکرین میں شامل ہیں جنہوں نے بہت بے باکی اور وضاحت سے یہ کہا کہ

"مثالی اسلامی معاشرہ کبھی بھی طبقاتی معاشرہ نہیں ہوسکتا"

علی شریعتی نے انبیائے کرام،محمد اور علی،ابوزر جیسی شخصیات کے اسوہ اور افکار کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خدائی معاشرہ طبقاتی نہیں ہوسکتا-علی شریعتی کے ہاں اس وقت سماج میں دو طبقات ہیں-اور یہ طبقات ہر پیغمبر کی تحریک کے آغاز کے وقت موجود تھے-

ایک طبقہ استحصالی ہے جس میں بادشاہ،جاگیر دار
،سرمایہ دار اور ان کے معاون غلط کار مذہبی
-اسٹبلشمنٹ ہے

دوسرا طبقہ استحصال زدہ کا ہے جو اکثریت میں ہے-
اور خدا اسی طبقے کا حامی ہے اور اس کی تعلیمات
-اسی طبقے کی نجات کے لیے ہیں

علی شریعتی قران کی علامتی زبان کی مدد سے سراغ
لگاتے ہیں اور یہ پالیتے ہیں کہ قابیل قران میں اقلیت
کی علامت جو ملکیت پر قابض ہے-اور یہ سماج کی
تقسیم کی علامت ہے-جبکہ ہابیل اکثریت کی علامت
ہے

شریعتی ہابیل و قابیل کی علامتوں کے زریعے سے
-قران میں جدلیاتی طبقاتی کشمکش کو اجاکر کرتا ہے

علی شریعتی کے نزدیک قابیلی نظام برائی کی جڑ
ہے-اور علی شریعتی ایک اور بات بہت زور دیکر
کہتے ہیں کہ قابیل فطرت کے اعتبار سے گناہگار نہیں
تھا-بلکہ یہ سماج کی نجی ملکیت کے تحت ہونے والی

تقسیم تھی جس نے اس کو لالچ اور استحصال کرنے
-پر مجبور کیا

علی شریعتی قران سے طبقاتی سماج کی ساخت کو
واضح کرتے ہیں-وہ کہتے ہیں کہ طبقاتی نظام جس کا
سربراہ قابیل ٹھہرا سماج کی سیاست،معشیت اور
مذہبی ثقافت پر قابض ہوجاتا ہے-ایسے طبقاتی نظام کا
سیاست میں آئیڈیل منتظم فرعون ہوا کرتا ہے-جبکہ
معشیت میں آئیڈیل قارون ہوا کرتا ہے-اور مذہبی ثقافت
کا نگران بلعم باعور ہوتا ہے-علی شریعتی کہتے ہیں
سیاست و معشیت و مذہبی ثقافت کے یہ تینوں آئیڈیل
چہرے شرک کے نمائندے ہیں-یہ توحید کے مخالف
اور عوام کو سرمایہ اور استحصال کے آگے جھکنے
پر مجبور کرتے ہیں-اور اس پر اتفاق رکھتے ہیں-
مذہبی ثقافت کا نگران بلعم باعور نظام سیاست و
معشیت کو خدا کی مرضی کے عین مطابق قرار دیتا
ہے

اس تثلیث پر قائم طبقاتی نظام کو مٹانا سب سے اہم کام
ہے-علی شریعتی کہتے ہیں کہ

"قران قابیلی طبقاتی نظام پر مبنی فکر کے مدمقابل یہ
سکھاتا ہے کہ تمام سیاسی ،معاشی اور مذہبی قوت کا
سرچشمہ عوام ہیں-قران میں خدا اور الناس اکثر
مترادف معنی استعمال ہوئے ہیں-عوام زمین پر نائب
خداوندی کے منصب پر فائز ہیں-حاکمیت خدا کی ہے
کا مطلب اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں-ملکیت کا تعلق
خدا سے ہے-مطلب سارا سرمایہ اور زرایع پیداوار
عوام کی مشترکہ ملکیت ہیں-مذہب خدا کا ہے مطلب
عوام کا ہے اور اس پر مذہبی پیشوائیت کی اجارہ
داری نہیں ہے"

ڈاکٹر علی شریعتی نے جہاں انسان کے اندر فجور و
تقوی کی جدلیاتی لڑائی دریافت کی اور پھر سماج کے
اندر طبقاتی بنیادوں پر جدلیات کا سراغ لگایا وہیں پر
انہوں نے علی شناسی کے بلند ترین مقام پر جاکر ایک
جدلیاتی تضاد خود اسلامی فکر کے اندر بھی جدلیات
کو تلاش کیا-اور اس کا سراغ ہمیں تاریخ اسلام سے
ملتاہے-اور علی کے خطبات،خطوط بھی اس کا پتہ

دیتے ہیں-علی شریعتی اس جدلیات بارے یوں گویا
ہوتے ہیں
ایک رجعتی اسلام ہے جو سٹیٹس کو کا تحفظ کرتا"
ہے اور ایک سچا انقلابی اسلام ہے جو سٹیٹس کو کو
"توڑنے کی بات کرتا ہے

علی شریعتی نے ایک مذہب کے اندر مذہب کے نام
پر ہونے والی کشمکش کو تاریخ مذہب کا مستقل
موجود دہنے والا مظہر قرار دیا-اور کہا کہ جب شرک
توحید سے کبھی شکست کھا جاتا ہے تو توحید کا لباس
پہن کر سچی توحید سے پھر لڑنے لگتا ہے-توحید جب
شرک کو شرناک شکست سے دوچار کرتی ہے تو
شرک توحید کا لبادہ پہن کر توحید کے نام پر ظلم ،بے
انصافی اور استحصال جیسی اقدار کو پھر سے غالب
کرنے کے لیے میدان میں اتر آتا ہے-اور یہ مذہبی
مابعدالطبیاتی عقائد کا رشتہ "عدل" انصاف،مساوات
اور حق کے ساتھ منقطع کرنے کی کوشش کرتا ہے-
اور زمین کو پھر سے اقلیت کے لیے جنت اور اکثریت
کے لیے جہنم بنانے میں مصروف ہوجاتا ہے-علی

شریعتی کہتے ہیں کہ یہ کام مذہبی ثقافت کے بلعم باعور سرانجام دیا کرتے ہیں-وہ ایسی مذہبی مباحثوں کا اہتمام کرتے ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں ہرتا-اور عقائد کی ایسی تعبیر غالب آجاتی ہے جس سے وہ عقائد منافع بخشی کی بجائے محض کتابی مسائل بن کر رہ جاتے ہیں-اور جب بھی استحصالیوں اور استحصال زدوں کے درمیان معرکہ ہوتاہے تو مذہبی ٹھیکدار استحصالیوں کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے-

علی شریعتی نے ایرانی سماج سمیت مسلم معاشروں میں مذہبی پیشوائیت کو اس لیے رد کیا کہ انہوں نے عقائد کو استحصال کرنے والوں کے زندان میں بند کیا اور عقائد کو تجریدی گورکھ دھندے میں گم کرڈالا-ان کی عمرانی جہت غارت کرڈالی-

ڈاکٹر علی شریعتی نے شیعت کے تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی جگہ لکھا

"صفوی شیعت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے-یہ بادشاہت،متعصب قوم پرستی اور بے عمل باطنیت کا

ملغوبہ ہے-اس کا کوئی تعلق سرخ شیعت سے نہیں ہے-اصل شیعت علوی شیعت ہے جو سرخ ہے"

ڈاکٹر علی شریعتی کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علی شناسی کے مکتب کو پھر سے زندہ کیا-اور گزرے سالوں میں مکتب علی کی آئیڈیالوجی پر جو شب خون مارا گیا تھا اس کا بخوبی ادراک کیا اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی-انہوں نے یہ تجزیہ کیا کہ بعد از وفات محمد اسلام کی سماجی بنیادوں کو بدلنے میں شب خون مارنے والے باہر سے آئے تھے-قابیل کے حامی خارج سے حملہ آور ہوئے تھے-ہلکے انحراف کو کلی انحراف میں بدلنے کی کوشش کی گئی تو خارج سے-محمداور علی کے وفاداروں کو ختم کرنے کی باہر سے سازش ہوتی رہی-ملوکیت ،غلام داری ،جاگیرداری،نسل پرستی اور ہوس زر کو رائج کرنے والوں نے توحید کا لباس زیب تن کرلیا-اس کے خلاف علی اور ان پیروکاروں نے مزاحمت کی-لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مکتب اہل بیت پر بھی قبضہ ہوا-محمد،علی،حسن،حسین کی قابیلی نظام کے خلاف جنگ

کو محض ایک قبائلی تنازعہ بنا دیا گیا-دشمن اب کی بار خارج سے نہیں بلکہ اندر سے حملہ آور ہوا-علی شریعتی نے اس داخلی دشمن اور حملہ آور کو پہچاننے اور لڑنے کی راہ کو سرخ شیعت اور اصل مکتب علی کی راہ قرار دیتے ہیں-

علی شریعتی نے ایرانی سماج میں خصوصی طور پر اور دیگر مسلم معاشروں میں عمومی طور پر توحید،عدل،رسالت،آخرت اور امامت سمیت جتنے مذہبی تصورات تھے ان کے عمرانی مقصد کی تلاش کی-اور یہ مقصد زمین پر بنی نوع انسان کی وحدت اور ان کے درمیان مساوات کا قیام تھا-اس مقصد کو جب اوجھل کردیا جاتا ہے تو شریعتی کے مطابق یہ تصورات جامد ہوجاتے ہیں-اور یہ انسانوں کے مسائل کے حل سے عاجز آجاتے ہیں-

وحدت بنی نوع انسان اور عالمگیر مساوات دو ایسے یوٹوپیا ہیں کہ جن کی مذہبی تصورات سے جدائی کا مطلب تقدیر پرستی اور جبریت کو غالب کرلینا ہے-تاریخ اسلامی میں جب علمائے دین نے بنو امیہ یا بنو

عباس کی جبری حکومتوں کو چھوٹی برائی کے طور
پر قبول کرلیا اور ایک طرح سے مذہب کے عمرانی
مقصد سے دست برداری اختیار کرڈالی اور غیر
مساوی سماج کو توحید کے منافی نہ تصور کرنے کا
رویہ پیدا ہوگیا تو ہم نے دیکھا کہ "علم اور سماجی
تبدیلی"کے باہمی رشتے اوجھل ہوگئے اور علم بس
دربار تک محدود ہوکر رہ گیا-اور سماج میں کمزور
طبقات کی نجات کا ہر تصور اور ہر تحریک گمراہی
اور فتنہ کہلانے لگی-مسلم تاریخ کو مرتب کرنے والے
سرکاری مورخوں نے بنو امیہ،بنو عباس کے دور میں
کسانوں،غلاموں اور مظلوم مذہبی و نسلی گروہوں کی
بغاوتوں اور خروج کو دین دشمنی سے ہی تعبیر کرلیا
اور ان کو گمراہ فرقوں کا نام دے دیا گیا-اختیار اور
آزادی اور حریت فکر کے فلسفے کو اعتزال کہہ کر
اور ان سے جھوٹی کہانیاں منسوب کرکے ان کو سماج
میں ممنوع قرار دے دیا گیا-اور یہ تک ہوا کہ ملوک
اور بادشاہ ظل باری خدا قرار پاگئے-اور عمل سے
فرار کی مذہبی آئیڈیالوجی غالب آگئی-شیعہ مکتب فکر

بھی اس رجحان سے محفوظ نہ رہا اور ایک وقت وہ
آیا کہ اس مکتب پر قابض مزھبی اشرافیہ ہی تبدیلی
-کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی

ایران کے اندر شعیہ کلرجی سیاست کو ہی شجر
ممنوعہ قرار دے چکی تھی-اور مہدی کی آمد تک
تبدیلی کی جدوجہد اور اجتماعی عدل کا قیام معطل
قرار دیتی تھی-علی شریعتی نے انتظار مہدی کی بنیاد
پر اجتماعی جدوجہد کو معطل کرنے والوں کی تعبیر
کے مقابلے میں انتظار کو جدلیاتی انتظار میں بدل ڈالا-
اور اور اس کو خدا کے وعدے کے ایفا ہونے کی دلیل
قرار دیا-یہ نئے انسان کی تخلیق اور نئے عہد کی
شروعات کے ناگزیر ہونے کی نشانی قرار پایا-یہ تعبیر
انتظار مہدی و مسیح کے عقیدے کو انقلابی رنگ دیتی
ہے اور اہل تسنن کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی
-شیعہ کے لیے

علی شریعتی نے مذھب کی ایسی تمام تعبیرات کو رد
کرڈالا جو انسان کو بے عمل بناتی تھیں-اور وہ اس کو
فکر علی کے متضاد کہا کرتے تھے-ان کے خیال میں

ایسی فکر یا ایسا عقیدہ جو انسانوں کو
ظلم،ناانصافی،جبر ،ستم اور محکومیت کی حالت کو
تسلیم کرنے پر آمادہ کرلے وہ مکتب علی کا عکس
نہیں ہوسکتا-اس کا علی کے مسلک سے کوئی تعلق
نہیں ہے-ان کے خیال میں جب جدوجہد کی ضرورت
ہو اس زمانے میں گوشہ نشین ہوجانا فکر علی کی بنیاد
گرادینے کے مترادف ہے-برے اعمال کے حامل
حکمرانوں کو ان کے حال پرچھوڑنے پر یقین کرلینا
اسوہ علی نہیں ہے-

علی نے میدان کبھی خالی نہیں چھوڑا-وہ عثمان کی
شہادت پر منصب خلافت کے امیدوار نہیں تھے لیکن
جب لوگوں نے ان سے اقامت حق اور دفع باطل کے
لیے خلافت قبول کرنے پر اصرار کیا تو وہ گوشہ
نشین نہیں ہوئے-جنگ جمل آئی تو بہت سے لوگ
غیرجانبداری کا لباس پہن کر گھروں تک محدود
ہوگئے-لیکن علی میدان سے نہیں گئے-پھر جب کوفہ
ہی رہ گیا اور باقی سب پر ظالم قابض ہوگئے تو بھی
کوفہ سے نقل مکانی نہیں کی- اور یہاں تک کہ شہید

ہوگئے-اس لیے علی شریعتی میدان میں ڈٹے رہنے کو
-اسوہ علی اور مکتب علی کا جوہر قرار دیتے ہیں

علی شریعتی کے زمانے تک آتے آتے بے عملی کا
رجحان بہت طاقت ور ہوچکا تھا-شیعہ اور اہل سنت
دونوں کے ہاں "فتنہ،حرج"کے حوالے سے ایک منظم
آئیڈیالوجی وجود میں آچکی تھی-عالم اسلام میں یہ
خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ منہاج نبوت پر قائم خلافت کا
دروانیہ تیس سال ہے اور اس خبر کی بنیاد پر یہ کہا
جاتا تھا کہ اب اصلاح احوال ممکن نہیں ہے-بس زاتی
ایمان کی حفاظت کی جائے-اور سماجی تبدیلی کی
اجتماعی جدوجہد نہ کی جائے-علمائے اہل سنت و اہل
تشیع نے ایسی کتب باقاعدہ لکھنے کا اہتمام کیا جن میں
ایسی احادیث و اخبار کو جمع کیا گیا جن میں قرب
قیامت کی نشانیوں کا بیان کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا
گیا کہ آنے والے ادوار شر اور برائی سے بھرے ہوں
گے-ان ادواروں میں گوشہ نشینی بہتر ہوگی-فتنہ کے
ایام میں میں بیٹھے کو کھڑے سے اور کھڑے کو
چلنے والے سے اور چلنے والے کو سوار سے بہتر

کہنے والی حدیثوں کو اپنی بے عملی کا سبب بنا لیا
گیا-آمد مہدی و مسیح کے عقیدے کی بنیاد پر سماجی
تبدیلی اور انقلاب کے تصور کو رد کردیا گیا-بلکہ یہاں
تک ہوا کہ اگر ظلم و انصاف کا بازار گرم رکھنے
والی حکومت آپ کو انفرادی عبادات سے نہ روکتی ہو
تو اس کے خلاف خروج کو ناجائز قرار دے دیا گیا-
یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ میں دور ملوکیت کے اندر
ہم نے علمائے اسلام کی اکثریت کو دربار سے وابستہ
دیکھا-اور جب نوآبادیاتی دور آیا تو یہ علماء یا تو
نوآبادی سامراجیوں یا پھر مقامی نوابوں یا جاگیرداروں
یا تاجروں کے دستر خوانوں پر نظر آئے-اور مذہب
جبر کے غلام نظر آئے-اور مابعدنوآبادیاتی دور میں یہ
مسلم معاشروں میں آمروں،بادشاہوں،حاکموں
،جاگیرداروں،سرمایہ داروں اور جابر نوکر شاہی کے
ساتھ کھڑے نظر آئے-اور سماجی تبدیلی کی تحریکوں
اور لہروں کو انہوں نے اسلام کی رجعت پسندانہ اور
بے عمل تعبیروں کے ساتھ روکنے کی کوشش کی-
اسلام کے نام پر تقدیرپرستی،شاہ پرستی ،بجریت اور

ظلم کا جواز تلاش کرنے کے لیے دن رات ایک کرڈالا-

ڈاکٹر علی شریعتی ایرانی سماج میں سانس لے رہے تھے-یہ سماج ایک عرصہ تک تو صفوی ملوکیت کے چنگل میں گرفتار رہا-اور اس صفوی ملوکیت نے ایران کے اندر انقلابی شیعت کو سیاہ رجعت پسند شیعت میں بدل ڈالا تھا-پھر یہ ایران رضا شاہ پہلوی کی شہنشاہیت کے قبضے میں آگیا جس نے یہاں مذہبیت کے رجعت پرستانہ ماڈل کو مزید گہرا کردیا-سامراج کی چاکری فرض اول بن گئی-ایسی فکر جس کی اول اینٹ انکار اور بغاوت پر استوار ہوئی تھی اس کو رجعتی فکر میں بدل دیا گیا-شیعہ مذہب پر اجارہ داری جمانے والے مولوی،مجتھد اور مراجع تقلید سب کے سب جبریت اور تقدیر پرستی کی آئیڈیالوجی پھیلانے میں مشغول تھے-اور وہ رضا شاہ پہلوی کی جابر حکومت اور اس کی سامراج نوازی کی حفاظت کررہے تھے-ایرانی معاشرہ محمد،علی،فاطمہ ،حسن،حسین،زینب،علی بن حسین،باقر،جعفر،موسی

کاظم سب کو جبریت اور رجعت پرستانہ آئیڈیالوجی
کے آئینے میں دیکھنے پر مجبور تھے-جبکہ دوسری
طرف ایرانی سماج کے اندر طبقاتی خلیج بڑھ گئی
تھی-ایک اقلیت سیاست،معشیت اور مذہب کے
سرچشموں پر قابض ہوچکی تھی-عوام،مستضعفین کو
نکال باہر گیا گیا تھا-ظلم ،ناانصافی،ناہمواری،عدم
مساوات اور تفرقہ و انتشار اپنے عروج پر تھا-یہ سب
دیکھر ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام شناسی ،علی
شناسی کا علم اٹھایا-اسلام کو تقدیر پرستی اور جبریت
سے الگ کرنے کے لیے انہوں نے ایرانی ملّاکریسی
کو للکارا-ایرانی سماج ہو-یا کوئی اور سماج وہاں پر
سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے سب سے بڑے
محافظ ملّا ہواکرتے ہیں-اور ان مذہبی اجارااداروں کے
گرد تقدیس کا ایک ہالہ بنا ہوا ہوتا ہے-اس کو چیلنج
کرنا سب سے مشکل ٹاسک رہا ہے-شریعتی ان بہادر
لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس نام نہاد تقدیس کو
چیلنج کیا اور ایرانی سماج کی نوجوار نسل کو اس ہالہ
کے سحر سے باہر نکالا-انہوں نے قابیلی نظام کے

بلعم باعوروں کو کسی ڈر اور خوف سے للکارنا بند نہ کیا-اور ان کو بے نقاب کیا-جبکہ انہوں نے شاہ ایران کے نظام باطل کی قلعی بھی خوب طشت ازبام کی-علی شریعتی ایرانی سماج میں وہ پہلے دانشور تھے جنہوں محنت کشوں،کسانوں،غریبوں ،عورتوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی محمد،علی،فاطمہ،حسن و حسین اور اہل بیت اطہار سب کے سب عوام کے کیمپ سے تعلق رکھتے تھے-اور ان کا خدا بھی انہی کے کیمپ سے تعلق رکھتا ہے-اور اسلام شناسی،علی شناسی کا مطلب ان کی نجات کی سبیل ہے نہ ان کی حالت کو خدا کی مشیت بتلانا ہے-یہی وجہ ہے کہ حسینیہ ارشاد سے شریعتی نے جن لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا ان کی شہرت پورے ایران میں پھیلنے لگی-اور ایرانی عوام شریعتی کو اپنا گرو اور مرشد ماننے لگے-شریعتی کی یہ فتح تھی کہ ایرانی سماج میں صفوی شیعت،پہلوی رجعت پرستی کا زوال ہونے لگا-شریعتی کی بے عملی کے خلاف غیر مصالحت پسندانہ جنگ نے علی شناسی کو انقلابی

مکتب میں بدل ڈالا-یہی وجہ ہے پورے ایران میں
-تبدیلی کی لہر شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی

علی شریعتی نے "شہادت و قربانی"کی ازسرنو تفہیم
کی-اور سب سے بڑھ کر شہادت امام حسین کی آزاد
فکر پر مبنی تعبیر کرکے تقدیر پرست فلسفے کو
-شکست سے دوچار کیا

اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کے ہاں شہادت امام
حسین اور واقعہ کربلا کی تشریح و توضیح میں تقدیر
اور مشئیت کا عنصر غالب تھا-زیادہ سے زیادہ
گریہ،زیادہ سے زیادہ سوگواریت،نوحہ گری،زنجیر
زنی کی فضا غالب تھی-لیکن یہ شریعتی تھے جنہوں
نے فلسفہ شہادت کی انقلاب اور آزاد عمل سے مطابقت
پیدا کی-انہوں نے شہادت کو انقلابی راستے سے تعبیر
کیا-اور ثابت کیا کہ شہادت حسین ظلم و بربریت کے
خلاف شعوری احتجاج تھا-اسلام کی حقیقی اقدار کی
گواہی تھی-اور اس بات کی ضمانت تھی کہ عقیدہ باقی
رہے گا-انہوں نے لکھا کہ

"جب احتجاج کے سارے راستے بند ہوجائیں،جب
انقلابیوں کو رشوت دیکر خاموش کردیا جائے یا ان کی
زبانوں کو لگام دینے کے لیے ان سے زندگی چھین لی
جائے-یا ان کو بے دست و پا کردیا جائے تو حسین کی
شہادت ہے جو رول ماڈل بنکر سامنے آتی ہے-انسان
کو شہید ہونے کا درس دیتی ہے-ایسی شہادت بے بسی
اور جبر کا نتیجہ نہیں ہوتی ہے-بلکہ یہ اختیاری اور
شعوری ہوتی ہے-سچی گواہی ہوتی ہے-اور ایسی
شہادت ایمپائر کو ہلاکر رکھ دیتی ہے"

"شہادت حسین تمام زمانے اور تمام نسلوں کو دعوت
دیتی ہے کہ اگر ظالموں کو مار نہ سکو تو ان
سے لڑتے ہوئے شہید ہوجاؤ"

شریعتی نے رسومات اہل تشیع اور علامات مذھبی کے
پس پردہ انقلاب کی روح کو دریافت کرلیا-اسی لیے
انہوں نے کہا کہ

"ہر میدان حق وباطل کربلا،ہر ماہ محرم اور ہر دن
عاشور ہے"

علی شناس ہونے کے اعتبار سے شریعتی نے میری رہنمائی بھی خوب کی-میں نے جب برصغیر کے اندر مذہب تشیع کے تاریخی ارتقاء پر نظر ڈالی تو مجھے نظر آیا کہ یہاں تشیع کی ایک غالب لہر دربار اور اقتدار کے ایوانوں سے اٹھی-مغل اور پھر مقامی حاکموں کے زمانے میں اشراف کے زیر اثر اور بعد میں نوابوں اور جاگیرداروں اور انگریز سرکار کے اندر سول و ملٹری سروس کی اشرافیہ نے جس مکتب علی کی انقلابیت کو فنا کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا-اور ان کی جانب سے ایسے مولوی،ذاکر اور کلرجی کی حوصلہ افزائی کی گئی جوکہ "سادات"کی اشرافیت کا تحفظ کریں اور ساتھ ساتھ ان کی مراعات اور جاگیروں کا جواز بھی تلاش کریں اور ان نوابوں اور جاگیرداروں کے استحصال کا جو شکار عوام ہے ان کو بے عمل تشیع اور اپنی حالت زار کو اللہ کی بنائی تقدیر کا نتیجہ خیال کریں-یہ لائسنسی تشیع اور مجاورانہ تشیع ملوک،نوابین اور انگریز سامراجیوں کی ایجاد تھی-اور آج تک یہ ہمارے ہاں چل رہی ہے-

علی کو مذہبی پیشواؤں نے فرقہ پرستی،تفرقہ بازی کے لیے تختہ مشق بنا رکھا تھا-اور آج بھی یہی صورت حال ہے-محمد،علی ،اور اہل بیت کی زوات کو مسلم معاشروں میں تقسیم اور انتشار کو بڑھانے کا فرض انہی پیشواؤں نے اپنے ہاتھ لے رکھا تھا-علی شریعتی نے ایسے ہی ماحول میں علی کو امین وحدت کے طور پر دریافت کیا-آپ عاشورہ محرم کے دنوں میں شریعتی کی تقریر "علی امین وحدت"پڑھئے آپ کو پتہ چلے گا کہ علی کی ذات کتنی بڑی وحدت واتحاد کی داعی تھی-اور کس قدر خلوص کے ساتھ وحدت کو پانے کی کوشش کی-

میں نے علی شناسی پر اپنے سابقہ لیکچروں میں تفصیل سے بتایا کہ کس طرح علی نے اپنے ذاتی حق اور زاتی مفاد پر اجتماعی مفاد پر ترجیح دی-اور کئی ایسے مواقع آئے جب وہ زاتی فائدہ اٹھا سکتے تھے تو نہیں اٹھایا-انہوں نے عثمان کے دور میں وحدت برقرار رکھنے کی کوشش کی اور نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ان کو مشاورت دی-لیکن ان کی کوششوں کو

ناکام بنانے میں ان لوگوں کا کردار تھا جو بعد میں ان سے جنگ کرنے نکل پڑے اور جنہوں نے طلحہ و زبیر جیسے جید اصحاب رسول کے خون کو گرانے سے بھی گریز نہ کیا اور ان کے چہرے آج بھی عام مسلمان پہچاننے سے قاصر نظر آتا ہے-

علی شناسی کے باب میں علی شریعتی نے "علی ایک دیو مالائی سچ" "علی امین وحدت" "در گفتگو ہائے تنہائی" "قلم اور عقیدہ" "عمرانیات اسلام" "تفیم اسلام" "چہرہ محمد" "فاطمہ فاطمہ است"جیسی معرکۃ الاراء کتب لکھیں-اور ان سے علی شناسی کا باب اور بھی روشن ہوگیا-

شریعتی نے علی شناسی کو بے عملی کی موت بناڈالا-ایرانی سماج میں باطل کے ایوانوں میں ان کی فکر سے زلزلہ آگیا-اور ایران انقلاب آشنا ہوگیا-اسی لیے شریعتی انقلاب ایران کے سرخیل کہلائے-

شریعتی کی علی شناسی کا ماڈل ایران تک محدود نہ رہا-ان کے اس ماڈل کو دیگر مسلم ملکوں میں بھی شہرت حاصل ہوئی-پاکستان کے اندر نوجوانوں میں

شریعتی کی علی شناسی نے صرف شیعہ نوجوانوں کو ہی نہیں بلکہ سنی نوجوانوں کو بھی متاثر کیا-آج بھی پاکستان کے اندر جب تکفیری شدت پسندی اپنے عروج پر ہے اور علی و اہل بیت پھر سے تفرقہ بازی کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں تو ایسے میں علی شناسی کے مکتب کو پھر سے امین وحدت بنانے کے لیے شریعتی کی کتب اور شریعتی کی فکر سے وابستگی بےحد ضروری ہے-جو بھی مکتب علی شناسی میں داخلے کا خواہش مند ہے اس کے لیے فکر علی شریعتی کو نصاب بنانے کی ضرورت ہے-کیونکہ شریعتی علی شناسی کے طلباء و طالبات کے ذہنوں پر قران کی علامت نگاری کے بھید آشکار کرتا ہے-علی کی نہج البلاغہ کی قرات سکھاتا ہے-اور میں یہ بھی کہتا ہوں عصر حاضر میں باب شہر العلم تک رسائی کے لیے شریعتی کے دروازے تک چلے آنا شرط اول ہے-پھر کہیں جاکر باب شہر العلم تک رسائی ہوتی ہے-

شریعتی کے ہاں ہمیں ایک اور خاصیت بھی ملتی ہے-اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے بےگانگي.اجنبیت اور

تنہائی کا وہ تجربہ بھی کیا جس کا علی نہج البلاغہ میں
موجود خطبات میں اکثر ذکر کرتے ہیں-اور شریعتی
نے علی کی اس تنہائی کو وجودیاتی تنہائی سے بھی
تعبیر کیا ہے-اور جب ان کو یہ حقیقت پتہ چلی تو ان
کا ملال مسرت میں بدل گیا اور ان کو اپنی فکر کے
حق ہونے میں کوئی شک نہ رہا-شریعتی کی پرمژدگی
ختم ہوگئی جب انہوں نے دیکھا کہ علی کو بھی اپنی
زندگی میں پستہ قامت اور تنگ ذہن لوگوں سے
طعنے،اعتراضات سننے کو ملے تھے-اور یہاں تک
کہ جن کا تحریک اسلام میں کوئی تعلق نہیں تھا وہ
بھی علی کی خدمات پر سوال اٹھاتے تھے-ان کے مقام
و مرتبے پر شکوک و شبہات پھیلانے کی کوشش
کرتے تھے-علی شریعتی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا-
-مگر علی شریعتی نے اپنی روش ترک نہ کی

ساواک جو شاہ ایران کی بدنام ترین ایجنسی تھی-وہ
شریعتی کے خلاف سرگرم ہوگئی-اور اس نے شریعتی
کے خلاف اپنے درباری ملّاؤں کو شکست فاش سے
دوچار ہوتے دیکھا تو شریعتی کی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ

کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا-شریعتی نے پہلے زیرزمین سرگرمیاں جاری رکھیں مگر جب انہوں نے شاہ کے ایجنٹوں کو تنگ ہوتا دائرہ دیکھا تو وہ خفیہ طریقے سے لندن چلے آئے-اور پھر ایک دن صبح وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے-ایک رات پہیلے ان سے ان کی بیٹی ملکر گئی تھی-اور اس نے شریعتی کو تندرست دیکھا تھا-اور علی شریعتی انقلاب ایران کی منزل کے قریب آجانے بارے بہت پرامید تھے اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنا کام مکمل کئے بنا مرنا نہیں چاہتے-مگر یہ آواز طبعی موت کا شکار ہوئی یا کسی سازش کا یہ آج تک پتہ نہیں چل سکا-شریعتی جسمانی طور تر چلےگئے مگر ان کے فکر کی روشنی آج بھی ضوفشانی کررہی ہے-شریعتی کل بھی ملائیت کے ہاں معتوب و متروک تھا اور عوام -میں مقبول و محبوب اور آج بھی مقبول و محبوب ہے

مجھے خوشی ہے کہ میں نے علی شناسی کے سب سے بڑے مبلغ اور داعی پر اپنا مقالے کا ایک باب مکمل کرلیا ہے-اور شریعتی جیسے علی شناس بارے

اپنے فہم کو اپنے قاری کے سامنے لانے میں کامیاب رہا ہوں-یہ باب ایسے وقت میں مکمل ہوا ہے جب شہادت امام جعفر صادق کا دن قریب ہے اور میں اسے بھی ایک رمز اور علامت شمار کرتا ہوں-جب یہ باب مکمل کررہا تھا تو راتوں کو خواب میں بھی اسی سے معاملہ ہوا کرتا تھا-شریعتی خود آجاتے اور ان کی آواز کی باز گشت میری ہمسفر ہوجایا کرتی تھی-اور لطف یہ ہے اس بازگشت کے سارے معانی امر مطالب مجھے یاد رہتے تھے اور میں نے ان کو اس باب میں شامل کیا ہے-

میں نے ڈاکٹر عبدالکریم سروش کا ایک انٹرویو علی شریعتی کے بارے میں پڑھا جس میں انہوں نے علی شریعتی کے ہاں "اسلام کے بطور آئیڈیالوجی"ہونے پر تنقید کرتے نظر آئے-اور جب میں نے بہت گھرائی میں جاکر ان کی باتوں پرغور کیا تو مجھے بات صاف ہوتی نظر آئی کہ سروش اسلامی فکر اور اسلامی

عقائد کو سرمایہ دارانہ نیولبرل مارکیٹ کے آئیڈیاز سے ہم آہنگ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور علی شریعتی کی آئیڈیالوجی اس کی اجازت نہیں دیتی-اس لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں علی شریعتی کے راستے کی پیروی کرنی چاہئے مگر جب پیروی کا وقت آتا ہے تو وہ ان کے راستے کو چھوڑ کر مغربی سرمایہ داری کی عمارت کو قائم رکھنے والی آئیڈیالوجی جوکہ آئیڈیالوجی کے انکار کے نام پر استوار ہوتی ہے کو اپنا لیتے ہیں-

علی شناسی اور مکتوبات علی

خط کسی بھی فرد کا ہو اس شخصیت کی فکر کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے-اس کے باطن اور اندورونی ذات کی آشنائی میں ہماری مدد کرتا ہے-کسی حد تک خطوط زیر بحث شخص کے انکشاف ذات میں ہماری مدد

کرتے ہیں-خط صرف صاحب خط کی ذات کا انکشاف نہیں کرتا بلکہ وہ خط کے مخاطب کی ذات کا انکشاف بھی کرنے میں مدگار ثابت ہوتا ہے-

علی کے خطوط میرے مطالعہ میں اس وقت سے ہیں جب سے میں نے تاریخ اسلام کے اندر خلافت اور اصحاب رسول کے مشاجرات بارے پڑھنا شروع کیا- میں نے ان کے خطوط جہاں سے دستیاب ہوسکتے تھے اکٹھے کئے اور ان کا ایک ساتھ مطالعہ بھی شروع کیا-

علی کے خطوط اور ان کے کلام کو جمع کرنے والوں کی ایک فہرست زمانے میں معروف ہے-ان میں ابو مخنف لوط بن یحیی،ابو اسحق ابراہیم،ابو منذر ہشام الکلبی،ابو عبدمعحمد بن عمرالواقدی،ابو مفضل نضر بن مزاحم،ابوالخیرصالح بن ابی العماد الرازی

،ابوالحسن علی محمد المدائنی،ابوالقاسم عبدالعظیم بن عبداللہ،ابواسحاق بن ابراہیم بن محمد الثقفی،ابوجعفرمحمد بن جریر الطبری،ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی،ابو احمد عبدالعزیز،ابومحمدالحسن بن علی شعبۃ الحرانی،ابوالحسن المعروف بہ مسعودی،ابوطالب بن ابی زید،ابو سعید منصور بن الحسین الآبی،زید بن وہب الجہنی،ابویعقوب اسماعیل بن ،میران الکوفی،سید شریف المرتضی رضی

علی کے کلام کے سب سے پہلے جامع عبداللہ بن رافع،مالک اشتر نخعی،اور حسن بصری تھے-
عبدالحمید بن یحیی کو علی کے ستر خطبات حفظ تھے-
ابن مقفع کو بھی کثیر تعداد میں خطبات و خطوط علی حفظ تھے-صوحہ بن صوحان کو بھی کلام علی حفظ -تھا

ابن عباس نے بھی کلام علی کو محفوظ کیا تھا-علامہ احمد ذکی صفوت مصری نے "جمہرۃ مکاتیب العرب"میں مکاتیب علی کو جمع کیا-اردو میں حکیم نبی احمد رام پوری جو کہ علام عرشی امتیاز رام پوری کے بھائی تھے (یہ ہوئی علامہ عرشی ہیں جنہوں نے استناد و ثقاہت نہج البلاغہ "پر معرکۃالآرء مقالہ ثبت کیا تھا)نے 64 مکاتیب علی کا مجموعہ ترتیب دیا-اور یہ کام بہت زیادہ سراہا گیا-حکیم صاحب کی کتاب،احمد زکی صفوت کی کتاب اور سید رضی کی کتاب میرے زیر مطالعہ زیادہ رہی ہے-اور تاریخ طبری نے بھی مجھے بہت فائدہ پہنچایا-

علی کے زیادہ تر خطوط ان کی خلافت کے دوران لکھے گئے ہیں جو تاریخ میں اور کتب قدیم میں ہمیں محفوظ ملتے ہیں-ان میں سب سے زیادہ خطوط

"معاویہ ابن ابی سفیان" کے نام ہیں-پھر اس کے بعد
اپنے عمال حکومت کے نام ہیں اور اس کے بعد اہل
-کوفہ کے نام اور چند ایک اہل بصرہ کے نام ہیں

ان خطوط کے متن کی جانچ کی جائے تو اکثر خطوط
کے موضوعات میں سب سے اول موضوع تو آپ کی
خلافت کا قضیہ ہے-دوسرا عثمان کی شہادت ہے اور
آپ کی بیعت توڑنے یا اس سے انکار کرنے والوں کے
موقف کا ہے-تیسرا قضیہ آپ کے اور دیگر اصحاب
کے درمیان تعلقات اور خدمات اسلام کا ہے-چوتھا
قضیہ علی کا بیعت ابی بکر میں تاخیر کا ہے-اس ہٹ
کر ان خطوط میں تصور آخرت،جواب دہی،دنیا پرستی
کی مذمت ،تصور عدل،تصور حکومت وغیرہ پر
-حضرت علی کا اظہار خیال ہے

معاویہ کے نام خطوط ایک تسلسل کے ساتھ ہماری مدد کرتے ہیں اس سارے معاملے کو سمجھنے کی جو علی اور معاویہ کے درمیان واقع ہوا-

علی کی جانب سے معاویہ کو پہلا خط جو لکھا گیا وہ تھا جس میں علی نے اشارے کئے اپنے اور معاویہ کے خاندان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے-اور اشارے سے شہادت عثمان کا زکر کیا-اور معاویہ کو کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ آئے اور بیعت کرے-

معاویہ ابن ابی سفیان نے اس خط کے جواب میں علی سے کہا کہ وہ قاتلان عثمان کو ان کے حوالے کردیں-اس بے جواب میں علی نے معاویہ کو پہلے تو اپنی بیعت کی ثقاہت بارے آگاہ کیا

اے معاویہ!میری بیعت ان لوگوں نے کی جنہوں نے"
ابی بکر،عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی-اور مہاجر
و انصار جس بات پر جمع ہوجائیں اس میں اللہ کی
رضا شامل ہوجاتی ہے-اور جو اس پر طعن کرتا ہے
وہ بدعت کا مرتکب ہوتا ہے-اس کو بیعت کے دائرہ
میں پہلے نصحیت کے زریعے لایا جاتا ہے پھر بھی
-نہ آئے تو اس سے جنگ ہوتی ہے

معاویہ!اگر تم عقل سلیم سے کام لوگےتو امر خلافت پر
نطر کروگے تو سمجھ جاؤگے-اگر تہمتیں تراشنی ہیں
-تو تراشتے رہو

معاویہ کا مقصد معاملے کی سمجھ بوجھ تھا ہی نہیں-
اس کا مقصد اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی
حکومت کا قیام تھا-اس مقصد کے لیے معاویہ نے
عمرو بن العاص کا تعاون انگا-عمر بن العاص نے

مصر کی گورنری کا عہد لیتے ہوئے معاویہ کا ساتھ
دینے کا فیصلہ کرلیا-عمر بن العاص کے ساتھ ساتھ
مغیرہ بن شعبہ تھے جنھوں نے پہلے علی کو آمادہ کرنا
چاہا کہ وہ معاویہ سے اتفاق کی راہ تلاش کریں-ان
تینوں کو ایک مکتبہ فکر بہت ذھین،مدبر،زیرک اور
صاحب بصیرت سیاست دان گردانتا ہے-تاریخ نے ان
کی رائے محفوظ رکھی ہے-مغیرہ بن شعبہ نے علی
کو طلحہ،زبیر اور معاویہ کو عراق،مصر،شام کے
گورنر بنانے مشورہ دیا تھا اور اپنے خیالات و
تصورات کو کچھ عرصے کے لیے موقوف کرنے کی
تجویز دی تھی-علی نے ان کو جواب دیا تھا کہ

طلحہ و زبیر کے معاملے میں غور کیا جاسکتا ہے-"
لیکن معاویہ کے معاملے میں ممکن نہیں ہے-اللہ

مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں معاویہ کی مدد کا

"طالب ہوں

مغیرہ نے جب علی کا یہ جواب سنا تو ان سے ناراض

-ہوگئے اور بعد میں معاویہ کے دست راس بنے

علی نے خلافت پر فائز ہونے کے بعد تمام عمال کو

خطوط ارسال کئے تھے کہ وہ ان کے پاس آئیں اور

بیعت لیں-اسی تناظر میں معاویہ کو خط ارسال ہوا تھا-

جس کے جواب میں معاویہ نے خون عثمان کے زمہ

داروں ی حوالگی کا مطالبہ کرڈالا تھا-علی نے اس کا

جواب بھی لکھا تو اس مرتبہ معاویہ نے فخر و مباہات

اور اپنے فضائل پر مبنی ایک خط لکھا-یہ خط جب

علی کو ملا تو علی نے اشعار میں جواب دیا

محمدالنبی اخی وصہری-و حمزۃ سیدالشہداءعمی

وجعفر ن الّذی یمسی و یضحی-یطیر مع الملائکۃ ابن عمی

و بنت محمد سکنی و عرسی-منوط لحمھا بدمی و لحمی

وسبطااحمد ولدای منھا-فایّکمو لہ سھم سھمی

سبقتکم ای اسلاما طفلا---صغیرا ما بلغت اؤ ان حلمی

اوجب طاعتی فرضنا علیکم----رسول اللہ یوم غدا برحمی

فویل ثمّہ ویل ثمّہ ویل –لمن یرد القیامۃ وھو خصمی

معاویہ نے اس خط کو پڑھنے کے بعد جو خط بھیجا وہ اشتعال دلانے والا تھا-اور معاویہ نے اس خط میں بنو امیہ کی مدح کی-اور بنو ہاشم کی ہجو-تو علی نے -اسی اسلوب میں معاویہ کو جواب دیا

اے معاویہ!اس میں کوئی شک نہیں میں نے تمہارے نانا(عتبہ)،تمہارے ماموں (ولید)اور تمہارے بھائی (حنظلہ ابن ابی سفیان)کو قتل کیا تھا-مییں نے جس تلوار سے ان کو قتل کیا وہ اب بھی میرے پاس ہے- میں نے نہ تو اپنے رب کو بدلا ہے ،نہ ہی نبی کو نہ ہی اس تلوارکو-تم جو چاہو کرو-تم مجھے ایک بہادر سپاہی پاؤگے-

العقد فرید میں عبد ربہ نے یہ لکھا ہے کہ

"میں نے اپنا دین نہیں بدلا جیسے تم نے بدل ڈالا ہے"

علی نے بہت واشگاف الفاظ میں بتلایا تھا کہ ماضی میں اگر تلوار معاویہ کے رشتہ داروں پر اٹھی تھی تو اس کی وجہ ان کا باطل کے ساتھ ان کے مقابلے مینڈ

آجاتا تھا-اب بھی صورت حال یہی ہے کہ معاویہ باطل کے ساتھ ان سے برسرپیکار ہے-

دور حاضر میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے خاندانی تنازعہ پر بہت لے دے ہوتی ہے-رجحان غالب یہ ہے کہ علی کی معاریہ سے لڑائی کو پرانی چشمک کا اثر قرار دیتے ہیں-لیکن علی اور معاویہ کے درمیان تنازعے میں اس چشمک کا علی کی جانب سے کوئی شائبہ نہیں تھا-ہم تاریخ کے کسی ایک گوشے سے بھی علی یا ان کے کسی اور قریبی شخص نے اسے خاندانی چشمک کا تعلق معاویہ سے تنازعہ کے ساتھ جوڑا ہو نہیں پاتے-

ہاں اس کو خاندانی اور نسلی تنازعے کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے کی-اور اس اختلاف کو خلافت شیخین کریمین کے ساتھ

تنازعے سے جوڑنے کی کوشش بھی معاویہ اور ان
-کے اصحاب کی جانب سے ہوئی تھی

دور حاضر میں جب بھی علی و معاویہ کے درمیان
ہونے والی لڑائی کا زکر آتا ہے یا علی کی عثمان پر
تنقید کا زکر چلتا ہے تو حامیان بنو امیہ اس تنازعے
کو بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان تاریخی چشمک
سے جوڑتے ہیں-اور وہ یہ کبھی نہیں بتلاتے کہ وہ
لڑائی کیسے شروع ہوئی تھی-تاریخ طبری سے لیکر
تمام تاریخی ماخذ میں لکھا ہے کہ عبد مناف جوکہ
بنوہاشم اور بنو امیہ کے جد تھے ان کا انتقال ہوا تو
قریش کے بڑوں نے عبد مناف کے زمہ رفادہ و سقایہ
کا جو کام تھا وہ ہاشم کے زمہ کردیا-امیہ یہ خدمت
خود لینا چاہتا تھا-اس لیے اس نے زاتی خرچ پر رفادہ
و سقایہ کی زمہ داری لینے کی پیشکش کی-مگر قریش

کے بڑوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا-امیہ دلبرداشتہ
ہوکر شام چلا گیا(طبری-جلد دوم،ص 181)امیہ نے
ہاشم کے سامنے اپنی یہ سبکی کبھی فراموش نہ کی
اور اس نے ہاشم کے خلاف اپنی نفرت آگے اپنے بیٹے
حرب میں منتقل کی جس نے عبدالمطلب کے خلاف
محاذ کھولا-عبدالمطلب کا ایک مالدار یہودی دوست تھا-
اور وہ عبدالمطلب کی مالی مدد بھی کیا کرتا تھا-حرب
کا خیال کہ اگر حرب کو قتل کردیا جائے تو عبدالمطلب
کی کمر ٹوٹ جائے گی-چناچہ قریش کے چند جوانوں
کو اس نے اس کام پر آمادہ کرلیا-جنہوں نے یہودی کو
قتل کرڈالا اور اس کے مال پر قبضہ کرلیا اور حرب
بن امیہ کی پناہ میں چلے گئے-عبدالمطلب نے حرب
کی اس حرکت کے خلاف قریش میں معاملہ اٹھایا اور
اپنے قبیلے سے بھی بات کی-قریب تھا کہ آل ہاشم اور

آل امیہ کے درمیان تصادم ہوجاتا کہ قریش کے بڑے
پھر سامنے آئے اور حرب کو لوٹا ہوا مال واپس دینا
پڑا اور جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا-یہ حرب ابی سفیان کا
والد اور معاویہ ابن ابی سفیان کا دادا تھا-حرب کے بعد
ابی سفیان اور اس کی آل بھی ہاشم کی اولاد کے پاس
رفادہ و سقایہ کی زمہ داری ہونے کو بھلا نہ پائی-
جبکہ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم سے
لیکر محمد ابن عربی تک سب کے سب ہاشمی مکّہ
میں بنو امیہ کی جانب سے لوگوں کے اموال کی لوٹ
مار کرنے اور زیادتی کرنے کی کوششوں کے خلاف
مزاحمت کی جاتی رہی-محمد علیہ السلام نے بھی
"حلف الفضول"کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی جو
ایسے ہی مظالم کے خلاف تھی اور محمد آحری وقت
تک اس معاہدے اور حلف پر فخر کرتے رہے-اس

تفصیل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بنو ہاشم نے نہ تو
یہ تنازعہ شروع کیا اور نہ ہی وہ رزیل سفلی جذبات
سے مغلوب ہوئے تھے بلکہ ان کا کردار شرافت و
نجابت والا تھا-قبل اسلام بھی ان کی بزرگی کا اعتراف
کیا جاتا تھا-اس کے برعکس امیہ،حرب اور ابی سفیان
سب کے سب ہاشم اور اس کی اولاد کو شرافت و
نجابت کی وجہ سے حاصل ہونے والے شرف کو دولت
اور سازش کے زریعے سے ہتھیانے کی کوشش
کررہے تھے-اس لیے دونوں کو ایک پلڑے میں رکھنا
-عدل و انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے

جب محمد نے اعلان نبوت کیا تو اس وقت بھی قریش
میں بنو امیہ والے تھے جنہوں نے اس اعلان کو اپنے
درینہ حسد کی روشنی میں دیکھا-وہ یہ کیسے برداشت
کرسکتے تھے کہ ایک اور شرف بھی بنو ہاشم کے

پاس چلا جائے-اور انہوں نے مخالفت کا علم سب سے
پہلے اٹھایا-قریش کا عاص سب سے پہلے اپنے خاندان
کے ساتھ دشمنی میں سب سے آگے ہوا-اسی طرح
قریش کا ایک اور بڑا نام جو پہلوان تھا-جنگ جو تھا-
درشت طبعیت کا مالک تھا-جس سے اہل مکّہ خوف
کھاتے تھے وہ عمرو بن ہشام تھا- جس کو محمد نے
ابوجہل کا لقب دیا-اسی طرح سے معاویہ کا چچا ابو
لہب اور چچی ہندہ تھے اور ہندہ کا والد عتبہ اس کے
بیٹے ولید یہ سب محمد کی دشمنی میں سب سے آگے
تھے-اس کے برعکس خاندان بنو ہاشم میں ابی طالب کا
گھرانہ،حمزہ کا گھر سمیت بہت سارے گھر تھے جو
محمد کے حمائیتی بن کر کھڑے ہوگئے-اسلام کے
آغاز میں بھی بنو ہاشم کے اکثر گھروں کا کردار بہت
بہتر تھا-اسلام میں فتح مکّہ تک جتنے بھی مراحل اور

آزمائش آئی بنو ہاشم کے اکثر لوگ اور محمد کے اہل
بیت کا کردار مثالی رہا اور بنوامیہ کے سرکردہ لوگوں
کا کردار بہت زیادہ دشمنی والا تھا-عاص نے محمد
کے صاحبزادے قاسم کی وفات پر آپ کو نعوزباللہ
"ابتر"(نسل بریدہ)کہنے کی جسارت کی تو اللہ نے
سورہ کوثر میں اس کو نسل بریدہ کہا-اور یہ عاص کا
بیٹا عمرو تھا جو معاویہ کا دست و بازو اور مشیر
خاص بن گیا تھا-ہندہ نے حمزہ کا کلیجہ چبالیا تھا-اور
معاویہ بھی بدر،احد،خندق کی جنگوں میں محمد اور ان
کے اصحاب کے مقابل آتا رہا تھا-ان لوگوں نے فتح
مکّہ کے وقت اسلام قبول کیا اور اس طرح سے
مشکلات و مصائب کے دور میں یہ سب کے سب
مخالف کیمپ میں کھڑے تھے-اس لیے جب ایسے
لوگوں نے علی کے مقابل آکر ان کی خلافت پر

اعتراض کرنا شروع کیا اور اپنے لیے حکومت پر
قابض ہونے کا خواب دیکھنے لگے اور مسلم برادری
کی امارت کا خواب دیکھنے لگے تو علی کو ان کو
آئینہ دکھانا پڑا-

"معاویہ تم جان لوا کہ جو دعوے تم کررہے ہو اس کے
نہ تو تم ماضی میں اہل تھے اور نہ ہی آج اہل ہو-
تمہارے پاس نہ تو معروف قول رسول ہے-نہ ہی
تمہارے پاس شاہد ہے-نہ ہی کتاب اللہ کی کسی
آیت(فضیلت)سے تمہارا کوئی تعلق ہے-نہ ہی رسول اللہ
نے تم سے کوئی معاہدہ کیا تھا"

امام علی نے اپنے اس مکتوب میں بہت وضاحت سے
بتادیا کہ معاویہ کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس
سے وہ خود کو خلافت و امارت کا اہل ثابت کرسکے-
اور علی کے خطوط کا یہ اسلوب ہے کہ وہ اکثر اپنے

خط کا آغاز تقوی اور پرہیز گاری اور خشیت و خوف
آخرت سے کرتے ہیں-معاویہ کے نام اکثر خطوط میں
یہی وتیرہ انہوں نے اپنایا ہے-وہ کہتے ہیں

اس وقت تم کیا کروگے جب تمہارا دینوی لبادہ اتر"
جائے گا-جس کی زینت پر تم مرمٹے ہو-اس کی لذات
نے تمہیں اپنی جاب مائل کرلیا ہے-اس وجہ سے
شیطان اور تمہارے درمیان تقوی کی جو آڑ ہوسکتی
تھی وہ باقی نہیں رہی-شیطان شدید گمراہ کرنے اور
ہلاک کرنے والا ہے-اور فنا کرنے والا ہے-وہ تمہارے
نفس میں قدم جماچکاہے-اس نے تمہیں بلایا تو تم نے
لبیک کہا-اس نے تمہیں جس راستے پر چلنے کو کہا تم
چل دئے-جو حکم دیا تم نے اس کو پورا کرڈالا-

دیکھو اس کام سے دستکش ہوجاؤ-آخرت میں حساب
کی فکر کرو-کیونکہ عنقریب تم ایسی جگہ کھڑے
"ہونگے جہاں کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکے گا

لیکن معاویہ نے سمجھ کر نہ دیا-ان پر حکومت و
امارت کی دھن سوار تھی سو جو من میں آیا کرتے
چلے گئے-اسی مذکورہ خط میں علی کہتے ہیں کہ

اے معاویہ!تم قریش کے سردار کب رہے؟کب تم اس"
امت کے امیر رہے؟نہ تمہیں کبھی قریش کی حاکمیت
-ملی-نہ ہی کوئی قدیمی شرف تم کو حاصل ہے

خواب غفلت سے جاگ جاؤ-اپنے خالق کی طرف لوٹ
آؤ-اس مصیبت کے لیے خود کو تیار کرو جو تم پر
آنے والی ہے-اپنے دشمن شیطان کو خود پر مسلط مت
کرو-مجھے اللہ اور اس کے رسول کے سچے ہونے

کی خوب معرفت ہے-اور میں پرانی بدبختی سے چمٹ جانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں-تم پر شیطان نے قبضہ جمالیا ہے-وہ تمہاری رگوں میں خون کی جگہ دوڑ رہا ہے-

یا رب ہمارے اور ہمارے دشمن کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمادے-اور بے شک تو ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے"

معاویہ کے نام خطوط میں علی کرم اللہ وجہہ نے معاویہ کی اسلام سے نسبت اور مقام بارے بہت تفصیل س لکھا-اس کے قیاسات کا تاروپود بھی بکھیرکر دکھایا-اور اس کی نفس پرستی اور طاغوت کی جانب رغبت پر اس کو تنبیہ بھی کی-تاریخ کے قرائن سے مجھے لگتا ہے کہ جب یہ خطوط معاویہ تک پہنچے اور ان میں اقتور دلائل کا اسے سامنا کرنا پڑا تو اس

نے عاص کے بیٹے عمرو کا تعاون حاصل کیا جس
نے معاویہ ابن ابی سفیان کو پینترہ بدلنے کا مشورہ
دیا-اس کا ادراک علی کو بھی ہوا-آپ نے عمرو بن
عاص کو پہلا نصحیت آمیز خط لکھا

دنیا انسان کو ہر شئے سے غافل کرتی ہے اور اپنی"
جانب متوجہ کرلیتی ہے-اور دنیا سے چمٹ جانے والا
ہر وقت دنیا کی طلب کرتا ہے-دنیا جتنی اسے حاصل
-ہو اس کی طلب اور حرص بڑھتی چلی جاتی ہے

مگر حقیقت یہ ہے انسان جن چیزوں کو جمع کرتا ہے
ان سے فراق لازم ہے-تو حوش نصیب وہ ہے جو
-دوسروں سے نصحیت حاصل کرے

اے عمرو!تم معاویہ کی غلط کاری کا ساتھ دیکر اعمال کو رائیگاں مت کرو-کیونکہ اس نے حق چھوڑ کر باطل کو اختیار کرڈالا ہے"

مگر حقیقت کا علی کو بھی علم تھا کہ ایسی نصحیتں شاطر دماغوں پر اثر نہیں کرتی ہیں-عمرو بن عاص نے جب معاویہ کو شاطرانہ مشورے دینے کا سلسلہ ختم نہ کیا-اور معاویہ کی جانب سے کئی اور ایشوز کھڑے کرنے کی روش سامنے آئی تو علی نے ایک اور مکتوب عمرو بن عاص کو لکھا-جس میں جلال و عتاب بہت زیادہ ہے-

"اللہ کے بندے علی کی جانب سے ابتر ابن ابتر عمرو بن العاص کے نام جو زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں محمد و آل محمد کا دشمن رہا-اس پر سلام جو ہدائت کے رسے پر چلا-

تم نے اپنی مروت ایک ایسے فاسق کے لیے ترک کرڈالی جس کے فسق کا پردہ فاش ہوچکا ہے-جو اپنی محفل میں کریم پر عیب لگاتا ہے-اور اپنی صحبت میں بردبار کو بے وقوف کہتا ہے-اب تمہارا دل اس کے تابع ہوگیا ہے-اس لیے اللہ نے تم سے تمہارا دین،امانت،دنیا اور آخرت سب سلب کرلی ہے-اللہ تمہارے حال سے باخبر ہے-

تم اس بھیڑئیے کی طرح ہو جو تاریکی میں بھی اور دن کی روشنی میں بھی شیر کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اس کے بچے کچھے چھوٹے شکار کی اوجھڑی تلاش کرتا رہتا ہے-

اے ابتر ابن ابتر اور جگر خوار ہندہ کے بیٹے کے چاکر!

اعمال بد کے نتائج سے فرار ممکن نہیں ہے-اگر تم
دونوں پر علی نے قابو پالیا تو دونوں کو بدر و احد و
احزاب کے مقتولین قریش کے ساتھ ملانے میں دیر
"نہیں کروں گا

یہ خط عمرو بن العاص کے نام اس وقت لکھا جب شام
سے عابد بے مثل امام علی کے پاس معاویہ کا خط
لیکر آئے تھے-اس خط میں معاویہ پہلی مرتبہ خون
عثمان کا الزام براہ راست علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی
زات پر لگایا-اہل بیت اور ان کی فضلیت کو چیلنج کیا-
اور ان کے اصحاب رسول خصوصی طور پر خلفائے
-ثلاثہ کے ساتھ تعلقات بارے سوالات اٹھائے

معاویہ تاریخ کا وہ پہلا آدمی ہے جس نے ابی
بکر،عمر ،عثمان کی فضیلت علی کے اوپر ثابت کرنے
کی کوشش کی-اور پھر یہاں تک کیا کہ بنو ہاشم پر

بنوامیہ کی فضلیت کا دعوی بھی کرڈالا-ہمیں تاریخ کی
کتب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ثقیفہ سے
لیکر شوری تک علی نے اصحاب رسول کے سامنے
فضلیت و قرابت اہل بیت بارے جو بھی دعوی کیا اور
دلیل دی اس کو کسی صحابی نے کبھی غلط قرار نہیں
دیا-کسی ایک صحابی نے بھی علی کی سبقت
اسلام،خدمات اسلام اور فضلیت کے باب میں سب سے
آگے ہونے پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا-اور کوئی
بھی اہل بیت کی فضیلت اور مقام کے مقابل کسی اور
شخصیت کو لیکر نہیں آیا-یہ معاویہ اور ان کے
اصحاب کی بدعت تھی کہ انہوں نے اس ایشو پر گمراہ
کن خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا-اور تاریخ میں
درج ہے کہ عبدالرحمان بن عوف نے جب بیعت میں
شرط پیروی شیخین رکھی تو علی نے اس کو تسلیم

کرنے سے انکار کیا اور اپنے حق اجتہاد کو ان کی
رائے پر فوقیت دی تھی-بلکہ طبری میں شوری اور
مسجد نبوی میں اجتماع اصحاب و مہاجرین کا ذکر
کرتے ہوئے آیا ہے کہ اس موقعہ پر عمار اور مقداد
نے قرابت رسول اور فضیلت اہل بیت بیان کی جس کی
تردید کسی جگہ سے نہ ہوئی-اور علی کو سب سے
بہتر اور بڑا مقام کا حامل کہا گیاتو بی تردید نہ ہوئی-
لیکن معاویہ نے اس قضیے کو پہلی مرتبہ چیلنج کیا-
علی کے لیے معاویہ کی جانب سے تواتر کے ساتھ یہ
پروپیگنڈا اور آپ کے مقام کو کم کرنے کی کوشش
بہت مظحکہ خیز لگی-آپ اس کا جواب لطیف پیرائے
-میں طنز کرتے ہوئے دیتے ہیں

زمان تمہاری گرفت میں ہے-اور تم عجائبات عالم کو"
ہمارے سامنے کھول کر بیان کرتے جاتے ہو-

تمہارا اسلام اور تاریخ اسلام پر بات کرنا ایسے ہے
جیسے ہجر شہر کو کھجوروں کا ٹوکرا کا روانہ کردیا
جائے(ہمارے ہاں اس کو الٹے بانس بریلی کو کہا جاتا
ہے)"

علی نے اپنے اس خط میں معاویہ کی جانب سے تاریخ
اسلام کی من مانی تفہیم اور تشریح کو مسترد کرڈالا
اور قبل اسلام اور دوران تحریک اسلام قریش کے
سرداروں اور ذیلی قبائل کا کردار،بنو امیہ کا کردار
واضح کیا-اور بنو ہاشم کے لوگوں کی جانب سے شعب
ابی طالب میں محصور ہوجانے کا زکر کیا-علی کہتے
ہیں کہ

"نیرنگی زمانہ تو دیکھئے کہ میرے مقابلے میں وہ
آرہا ہے جو نہ تو سابقون میں سے ہے اور نہ ہی

آخرون میں سے ہے-نہ ہی اسلام میں وہ کوئی فضیلت

"-کا حامل ہے

معاویہ نے اصحاب رسول ابی بکر و عمر اور عثمان

س علی کے اختلاف کو حسد اور ہوس حکومت کا

نتیجہ کہنے کی کوشش بھی کی-علی اس کا جواب بھی

دیتے ہیں کہ

پھر تم نے جو خلفاء سے میرے حسد ،ان کی طرف"

دیر سے بڑھنے اور بغاوت کا تذکرہ کیا ہے-بغاوت

سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں-میری تاخیر اور ان کے

حکومت کرنے پر اختلاف کی جو وجہ ہے اس پر

مجھے کسی سے معذرت کی ضرورت نہیں-کیونکہ

اس شکا فیصلہ اللہ کریم نے بعد از وفات رسول خود

-فرمادیا

قریش نے کہا تھا کہ امیر ہم سے ہو اور انصار نے کہا کہ ہم میں سے ہو-پھر قریش والوں نے کہا کہ محمد ہم میں سے تھے تو ہم زیادہ حقدار ہیں-بات انصار کے سمجھ آگئي اور حکومت مہاجرین کے حوالے کردی گئی-تو جس کا تعلق محمد سے قریبی ہوگا وہ مستحق خلافت بھی زیادہ ہوگا"

علی نے اوپر واضح کیا کہ جو دلیل مہاجر اصحاب نے انصار کو دی تھی اس کی رو سے تو خلافت کا سب سے بڑا اہل علی تھے-نہروان کی جنگ ختم ہوئی تو اہل شام کے پروپیگنڈے کے اثرات کوفہ میں بھی نظر آئے تو حجر ابن عدی ،عمروالحمق،عبداللہ ابن وہب خلافت بارے سوال کیا-اور خلفاء بارے خیال پوچھا تو علی کا جواب یوں تھا

جب محمد دار فانی سے تشریف لے گئے تو مسلمان"
امارت و خلافت کے سوال پر جھگڑ پڑے-خدا کی قسم
مجھے گمان بھی نہ تھا کہ عرب اس امر کو میری
بجائے کسی اور جگہ منتقل کردیں گے-اس لیے جب
لوگ ابی بکر کی جانب توجہ کر چکے تو مجھے
سخت تعجب ہوا-میں بیعت سے اس لیے رکا کہ میں
خلافت کا حقدار خود کو خیال کرتا تھا-نہ کہ منتخب
شدہ ہوکر-حب تک مشیت خداوندی تھی میں رکا رہا-
لیکن جب میں نے دیکھ کہ بڑے لوگ دین محمدی سے
پھر گئے ہیں اور دین محمدی و ملت ابراہیمی کو
مٹانے کی کوشش ہورہی ہے تو مجھے لگا کہ اب بھی
میں نے اسلام اور لوگوں کی مدد نہ کی تو دین میں
اور شگاف پیدا ہوں گے-اور ٹوٹ پھوٹ ہوگی-اور یہ
مصیبت حکومت نہ شملنے سے کہیں زیادہ

ہوگی-..................اسی لیے میں نے جاکر بیعت کرلی"

علی کہتے ہیں کہ

"ابوبکر نے حاکم بنکر نرمی برتی-سیدھے رستے پر چلایا،علو سے بچے-میانہ روی اختیار کی-میرا ان کے ساتھ امور میں خیرخواہانہ رہا-اور اطاعت خدا کی ہر کوشش میں ان کے ساتھ رہا-ابوبکر کا وقت قریب آیا تو انہوں خلافت عمر کے سپرد کردی-................"

علی ایک اور جگہ لکھتے ہیں

"قحافہ کے بیٹے نے چوغہ خلافت زبردستی پہن لیا تھا-.........اپنی نامزدگی پر وہ ساری عمر ندامت کا شکار رہے-مگر جاتے وقت عمر کو نامزد کرگئے-

عمر کا وقت قریب آیا تو میرا یہ خیال تھا کہ اب یہ امر میرے سے باہر نہیں جائے گا-لیکن انہوں نے شوری بنادی جس کا ایک رکن میں تھا-علی نے شوری کی جانب داری اور ابن عوف کی اقرباء پروری پر بات کی-"

علی نے اپنے خطوط میں بہت ساری جگھوں پر امر خلافت کے بارے میں تفصیل سے زکر کیا-ان سب عبارات کو اگر جمع کرکے دیکھا جائے ایک بات ہم شرح صدر سے کہہ سکتے ہیں کہ علی کو اس بات کا یقین تھا کہ قرابت رسول شرط ہو یا خدمات اسلام اصول ہو-علم و فراست شر ط ہو یا شجاعت تو جان نشینی کا حق ان کا بنتا تھا-علی کہتے ہیں کہ وہ اپنے حق کے لیے لڑے اس لیے نہیں کہ اس سے اسلام کو

ناقابل تلافی نقصان ہوسکتا تھا-اپنے حق پر انہوں نے
-اجتماعی مفاد کو ترجیح دی

مکتوبات علی میں یہ بات بھی واضح ہے کہ بنو امیہ
اور قریش کے بعدازاسلام لانے والے امراء نے ان کو
خلافت سے شعوری طور پر محروم کیا جس پر اپنے
-غصے کا اظہار بھی ان مکتوبات میں ملتا ہے

مہاجر اور انصار اصحاب رسول سے ان مکتوبات میں
علی کا یہ گلہ بھی درج ملتا ہے کہ وہ اہل بیت کے
مرتبے،مقام اور فضیلت سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان
-سے انصاف سے کام نہ لے سکے

ایک طرف تو علی کو خلافت میں ہونےوالی ناانصافی
پر دکھ کا سامنا تھا تو میراث رسول بارے ان کی اور
فاطمہ کی رائے بھی ابی بکر و عمر نے قبول نہ کی-

پھر یہ ہوا کہ ایک وقت میں کتاب اللہ اور سنت رسول

کے برابر درجہ ابی بکر و عمر کے اجتہاد کو دیا

جانے لگا-اس روش کی مخالفت بھی علی کی جانب

سے ہوئی-علی نے مکتوبات میں اس کا زکر کیا ہے-

لیکن علی اور کئی اور اصحاب رسول کی جانب سے

آزادانہ اجتہاد کی روش بارے کسی نے زیادہ ہائپ پیدا

نہ کی-یہ ہائپ پیدا کرنے اور اس کو بنیاد بنکر سب و

شتم تک پہنچ جانے کی رسم بد بنوامیہ کی جانب سے

شروع کی گئی-اور یہ معاویہ،مروان،عمرو بن

العاص ،مغیرہ بن شعبہ جیسے لوگ تھے جنہوں نے

علی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناموس صحابہ جس کو

کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا کا علم بلند کرنے لگے-علی

کے خطوط گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے اس چال کا

اندازا لگا لیا تھا-اور انہوں نے تحفظ ناموس اصحاب

رسول کے پردے میں سیاست کے اصل چہرے کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کرڈالا-مسئلہ ابی بکر و عمر کی ناموس یا عثمان کے قصاص کا نہیں تھا-بلکہ مقصد اقتدار پر قابض ہونا تھا-

جنگ جمل میں مروان کے ہاتھوں طلحہ کا قتل،ام المومنین کو بئر حوشب کا نہ بتانا،صفین میں نیزوں پر قران بلند کرنا اور ثالثی کے دوران عہد سے پھرنا-یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مخالفین علی کی سیاست دھوکہ،چالاکی،شاطر پن اور موقعہ پرستی کے سوا کچھ نہ تھی-مجھے حیرت ہے کہ اس طرح کی سیاست کو تدبر اور مہارت کہنے کی ہمت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے-جبکہ علی کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچے بغیر سیاست اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں

ہوسکتی-علی کے ہاں سیاست اور اخلاقیات جدا ہونے
والے نہیں ہیں-وہ اخلاقیات کے سوال کو بار بار
اٹھاتے ہیں-اور وہ حق کی بالادستی کے لیے حق کے
زرایع کو کسی حالت میں ترک کرنے کو تیار نہیں
ہیں-علی اجتماعی مفاد پر زاتی مفاد قربان کرنے سے
کبھی دریغ نہیں کرتے تھے-

علی نے دولت اور جاگیروں کی لالچ نہ دی-اور حق پر
جمے رہے-ایسے لوگوں کو اپنا ہمنوا نہیں بنایا جو
عرب کے قبیلوں کے بڑے شجاع اور عقلمند شمار
ہوتے تھے-مگر ان کے ہاں اخلاقیات کے لیے کوئی
جگہ نہ تھی-علی کے طرز حکومت کے ناقد یہ تنقید
کرتے ہیں کہ انہوں نے کوفہ میں اپنے اردگرد ان
لوگوں کو اکٹھا کیا جو وہد و ورع ،تقوی اور
پرھیزگاری میں سب سے آگے تھے-مگر اپنے قبیلے

میں شجاعت و بہادری میں معروف نہ تھے-بادی النظر
میں یہ تنقید بہت بھاری لگتی ہے-مگر تاریخ میں جو
جنگیں علی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے لڑیں ان
میں علی کے لشکر فتح یاب ہوئے-جنگ جمل میں
جیت ہوئی-صفین میں میدان ہاتھ رہا مگر ڈپلومیسی میں
لوگوں کی غلطی نے معاویہ کو مکمل شکست سے
بچالیا-نہروان میں خوارج کی کمر توڑ ڈالی-علی کی
آئیڈیالوجی کی نظر سے آپ علی کے طرز حکومت کا
جائزہ لیا جائے تو وہ اسلامی تحریک کو قبیل داری
اور نسل پرستی کے زھر سے بچانے کی کوشش
کررہے تھے-وہ وحدت اور مساوات کو اپنی آئیڈیالوجی
کی اساس قرار دئے ہوئے تھے-اگر وہ قبیل داری اور
نسل پرستی کو اساس بنا لیتے تو ان کی کسی سے بھی
لڑائی نہ ہوتی-علی کے مدمقابل آنے والوں کی خواہش

کے مطابق ان کو عہدے اور مناصب مل جاتے تو
قصاص عثمان سمیت سارے مطالبات ختم ہوجاتے-اور
علی کی حکومت بھی سکون سے چلتی رہتی-لیکن علی
کے نزدیک خلافت حق کے قیام اور باطل کو مٹانے کا
وسیلہ تھی نہ کہ بذات خود ایک مقصد-وہ اس حکومت
کو اقرباء پروری اور مل بانٹ کر کھانے کا زریعہ
خیال نہیں کرتے تھے-علی امارت برائے امارت کے
قائل نہ تھے-

علی دور عثمان کے ان گورنروں کو ایک پل کے لیے
برداشت کرنے کو تیار نہ تھے جو بیت المال میں غبن
اور عوام پر جبر کے مرتکب ہوئے تھے-وہ نااہلی اور
بدعنوانی کو برداشت کرنے کے حامی نہیں تھے-وہ
خوف خدا سے عاری عاملین حکومت کو معزول کرنا

چاہتے تھے-ایسے لوگوں کو وہ فاسق خیال کرتے تھے-

علی کے مکتوبات کو پڑھکر صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے رفقاء،بھائیوں،بیٹوں اور اپنے سے لڑنے والے سب سے برابر احتساب کے قائل تھے-وہ سب کو خود احتسابی کی عادت ڈالنا چاہتے تھے-اور دیانت داری کے چلن کو عام کرنے کا خیال رکھتے تھے-وہ جواب دہی سے فرار کو سب سے بڑی عافت خیال کرتے تھے-علی کے خطوط دین میں خیر خواہی،اور امن و سلامتی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں-وہ دنیا اور مال کی محبت سے دور رہنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں-علی کے خطوط سے اجتماعی فلاح کے حصول کی کوشش کرنے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں-نفسانی خواہشات سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ

بتاتے ہیں-ان خطوط میں عثمان بن حنیف،قیس بن سعد
بن عبادہ،عبداللہ بن عباس،محمد بن ابی بکر اور دیگر
گورنروں اور عاملین کے نام خطوط ہیں-ان خطوط میں
آپ نے اپنے تصور عدل ،حاکمیت ،معاشی فلاح و
بہبود اور انصاف جیسی اقدار کو بیان کیا ہے-ان
تصورات کے مطالعہ سے ہمیں سیاست علی اور
سیاست معاویہ کے درمیان بنیادی فرق کا پتہ چلتا ہے-
آپ نے ابی بکر کے بیٹے محمد کو سب سے بڑے
صوبے مصر کا گورنر مقرر کیا-اسی طرح محمد بن
ابی بکر کی مالک اشتر کو گورنر بنایا تو دونوں کو
خطوط میں نصحیت یہ کی کہ وہ نفس کے فریب میں
مبتلا نہ ہوں-خوف خدا رکھیں-مال کی محبت پیدا نہ
کریں اور لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیں-
محمد بن ابی بکر کو نصیحت آموز خط میں انہوں نے

ایک پتہ کی بات کی کہ اصل خطرہ نفاق سے ہے-یہ اگر دل میں جڑ پکڑ لے تو ہلاکت یقینی ہوتی ہے اور یہ ایسا مرض ہے جس کا علاج ممکن نہیں ہے-علی اپنے زمانہ حکومت میں اسی مرض نفاق میں مبتلا لوگوں کی بیخ کنی کے لیے کام کرتے رہے-

علی کے ان خطوط کی عصر حاضر میں ایک اہمیت یہ ہے کہ ان خطوط سے ہم "مقام اصحاب رسول" اور "خلافت"جیسے ایشوز پر راہ اعتدال کی جانب جاسکتے ہیں-اور ان خطوط کی مدد سے ہمیں "افضلیت "جیسے فروعی مسائل پر بھی صائب راہ اختیار کرنے کی راہ میسے آسکتی ہے-

یہ خطوط اس نام نہاد سلفی اور حقیقت میں تکفیری گمراہ کن مسلک کے خلاف فیصلہ کن جواب ہیں جس نے پوری اسلامی دنیا میں فتنہ،فساد اور قتل و غارت

گری کا بازار گرم کررکھا ہےاس فتنے سے نمٹنے کی راہ بھی ان خطوط سے میسر آتی ہے-

علی کے یہ خطوط فرقہ وارانہ سوچ اور چوکھٹوں کو شکستہ کرتے ہیں-علی کو کسی فرقہ وارانہ لبادے میں چھپانا "علی شناسی "نہیں بلکہ "علی سازی"ہے-اور "علی سازی"کے نام پر تدلیس و تلبیس ہے-نابغہ علی کا نابغہ پن ان کو کسی تنگ نظر آئیڈیالوجی میں سمونے سے روکتا ہے-علی کے مکتوبات کو بار بار پڑھنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کا فقر اختیاری تھا-آپ کا زہد بھی آپ کی مرضی و منشاء سے تھا-آپ نے قناعت اور درویشی کا راستہ اپنی فکر کے ناگزیر تقاضا کے طور پر اپنایا تھا-استحصال ،لوٹ مار سے ہٹ کر آپ جائز راستے سے بھی

پرتعیش زندگی گزارنے کو اپنے مسلک کے خلاف تصور کرتے تھے-

حق گوئی کے سامنے کسی مصلحت کو آنے نہیں دیتے تھے-آپ اپنے اصول،اخلاقیات دوستوں،عزیزوں پر قربان کرنے کے قائل نہ تھے-اس راہ میں کوئی نقصان آڑے آتا تو آپ اس کوبرداشت کرتے تھے-ان کے عدل نے ابن عباس کی جانب سے اپنے فرائض میں زرا سا تساہل برداشت نہ کیا-ابن عباس کو اس تساہل پر فریب نفس کے کون کون سے وعظ انہوں نے نہ سنائے اور اس راہ میں ابن عباس کے لاتعلق ہوجانے کی پرواہ بھی نہیں کی-انہوں نے اسی طرح اپنے بھائی عقیل کی بے وفائی برداشت کی-اور اپنے اصول ترک نہ کئے-

اجتماعی انصاف سے لیکر نفس کی پاکیزگی اور اصلاح کے معاملے میں علی ایک مرتبہ بھی کمزور

نہ پڑے-انہوں نے اپنے علم اور عمل میں ہم آہنگی کی
-بہترین مثال پیدا کی

علی کے ہاں دنیا پرستی سب سے بڑا جرم تھا-اور
سلمان فارسی کے نام علی کے لکھے خط کی عبارت
ملاحظہ کریں

بے شک دنیا ایک سانپ کی مثل ہے جو چھونے میں"
نرم معلوم ہوتا ہے مگر اس کی تباہ کاری بہت سخت
ہوتی ہے-اس لیے دنیا کی جو شئے تمہیں غافل کرے
اس کی قلیل مدت کو یاد کرکے اس سے بچو-اور
ایسے ہوجاؤ کہ جو کچھ دنیا میں ہو اس سے مانوس
رہو لیکن خود کو اس دنیا میں مکمل طور پر ڈوب
"جانے سے خود کو بچاؤ

علی کی جانب سے دنیا پرستی کی مذمت اس زمانے میں کی جارہی تھی جب پیدائش دولت اور آسائش زندگی کا وہ تصور اور اس کے لیے آج موجود زرایع موجود نہ تھے-آج کی دنیا پرستی کی بدترین شکل سرمایہ داروں کی دنیا پرستی ہے جس کی بنیاد استحصال کے سخت ترین تصور پر اٹھی ہوئی ہے-سرمایہ پرست دنیاداری سے علی کی نفرت کا ہم اندازا لگاسکتے ہیں-

فکر مرتضوی کا یہ وہ پہلو ہے جس کو نہ تو آج اہل تسنن کی مساجد کے منبروں سے سناجاسکتا ہے اور نہ ہی اہل تشیع کی امام بارگاہوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے-علی اور اہل بیت کی شخصیات کے گرد جھوٹے قصّے ،کہانیوں کا ہالہ تو بنا جاتا ہے-لیکن

ان کے سماجی تصورات اور سماجی کردار پر بات

نہیں ہوتی-

کالے عمامے،سیاہ عبایا "علی اور فکر علی"سے شناسا

کرنے کی بجائے ان کی دھندلانے اور ان سے دور

رکھنے کا کام کررہے ہیں-اسلامی تحریک میں

عدل،انصاف اور مساوات کا جو مقام ہے وہ مساجد کے

منبروں پر براجمان ملائیت کا موضوع نہ ہے-بلکہ

موضوعات ان کے ہاں وہی ہیں جن کو بنو امیہ اور

دنیا دار حاکموں نے اٹھایا تھا-وہ "علی اور اصحاب

رسول"کے درمیان فضلیت کے تنازعہ کو سامنے لیکر

آئے-مقصد یہ تھا کہ انہوں نے عدل و انصاف کی اقدار

سے جو انحراف کیا ہے اس پر بات نہ ہوسکے-وہ

فرقہ پرستی کی دھول اس قدر اڑانے کے قائل تھے کہ

سکے-اور ان کے اصل بات لوگوں کے زیر بحث نہ آ

اقتدار کی راہ ہموار ہوسکے-فکر مرتضی کے نام پر
فکر مرتضی کی نفی کرنے کی کوشش بھی ہوئی اور
آج تک یہ عمل جاری وساری ہے-

مکتوبات علی اور تاریخ میں موجود شواہد کی رو سے
ایک اور سوال کا جواب بھی میں یہاں دینا چاہتا ہوں-
اور وہ سوال یل ہے کہ علی اور معاویہ کے درمیان
تصفیہ کیوں نہ ہوسکا؟

اس کا جواب مکتوبات کی روشنی میں یہ بنتا ہے کہ
علی کے نزدیک حکومت اور ولائت کا جو تصور قران
اور سنت سے بنتا تھا معاویہ اور ان کے رفقاء اس کے
الٹ تصور حکومت و ولائت کے قائل تھے-پھر معاویہ
اور اس کے ساتھی علی کے ساتھ باقاعدہ مناظرہ
کرنے سے بھی بھاگتے رہے-معاویہ قتل عثمان اور
اس کے بعد والے واقعات کو نسلی تنازعہ کی روشنی

میں دیکھتے رہے-علی سب سے پہلے سب سے ان کی
بیعت کو مان لینے کا مطالبہ کررہے تھےاور ان کی
بیعت پر انصار و مہاجرین کا اجماع ہوا تھا-معاویہ
علی سے صلح کے بدلے شام،مصر اور ایران کی
حکومتیں طلب کررہے تھے-علی کو معاویہ کی یہ
شرائط قبول نہ تھی-اس لیے علی اور معاویہ کے
درمیان کوئی تصفیہ نہ ہوسکا-معاویہ نے علی کے زیر
کنٹرول علاقوں کو چھیننے کے لیے جو حکمت عملی
اپنائی وہ ایسی تھی جس میں کسی اصول اور کسی
اخلاقیات کی گنجائش نہ تھی-پراکسی وار،نسلی و
مذہبی تضادات کو بڑھانے کی کوشش اس کا حصہ
تھی-جبکہ علی کے مکتوبات اس بات کا ثبوت ہیں کہ
ان کے پیش نظر امارت و حکومت ایک زمہ داری
تھی-یہ منفعت اور مراعات کا وسیلہ نہ تھی-جب وہ

خود عیش و عشرت کے قائل نہ تھے تو دوسروں کو
بیت المال سے عیش کرنے کے سامان کیسے فراہم
کرتے-ان کے خیال میں امارت پر قائم رہنے کے لیے
فاجروں اور فاسقوں کو فوجی عہدے دینا یا ان کو
صوبوں کا گورنر بنانا گناہ کبیرہ اور اللہ سے بدعہدی
کے مترادف تھا-انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا-ان
مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو مغیرہ بن شعبہ ،ابو
موسی اشعری،ابومسلم خولانی اور جریر بن عبداللہ نے
جن شرائط کے ساتھ معاویہ سے صلح کی پیشکش کی
وہ علی کو اس یے قبول نہ تھیں کہ ان سے اسلام کے
اصول و مبادی کی نفی ہوتی تھی-امارت ان کے ہاں
قیام حق اور دفع باطل سے ہٹ کر کچھ نہ تھی-اس
سے ہٹ کر وہ کوئی راہ اختیار کرنے کے حق میں نہ
تھے-

علی کے مکتوبات کی رو سے ان کے مدمقابل وہ لوگ تھے جن کے فہم اسلام اور بلوغت اتقاء پر ان کو سخت تحفظات تھے-ان کا طرز حکومت اور فلسفہ زندگی اسلام،قران اور سنت رسول کے ساتھ ساتھ مہاجر و انصار اصحاب کی اجتماعی روش کے خلاف لگتا تھا-انہوں نے اپنے مکتوبات میں اس امر کا بار بار زکر کیا-وہ ان لوگوں کو رہبری اور حکومت دینے کے حق میں نہ تھے-وہ ان سے سمجھوتے کی بجائے ان سے جنگ کرتے ہوئے مارے جانا بہتر خیال کرتے تھے-انہیں یہ بھی پرواہ نہ تھی کہ ان کے ساتھ کون رہتا ہے اور کون نہیں-

علی کے مکتوبات یہ واضح کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں ان کے مخالفین اسلام کے تصور مالیات اور تصور تقسیم اموال اور تصور جواب دہی کو مسخ

کرکے مسلم معاشرے کو واپس اس دور میں لیجانے
کے خواہش مند تھے جوکہ زمانہ جاہلیت تھا اور قریش
کے سردار اپنے ظلم و استحصال کو اپنے آباء کا دین
کہا کرتے تھے-علی اسی لیے اپنے مکتوبات میں اسلام
سے قبل کی حالت اور پھر اسلام کے آغاز و وسط کے
دوران قریش مکّہ کی حالت اور کردار کا تذکرہ بار بار
کرتے ہیں-وہ اس انحراف سے سمجھوتہ کرنے پر خود
کو راضی نہ کرپائے-اس لیے انہوں نے لڑے کی راہ
اختیار کی-

ان مکتوبات میں علی نے اپنے طرزسیاست اور فوجی
حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ناقدوں کو
جواب دینے کی کوشش کی ہے-علی کی عسکری
حکمت عملی دفاعی کی بجائے جارحانہ تھی-جب ان
کے پیروؤں نے ان کی اس فوجی حکمت عملی پر عمل

کیا فتح ان کا مقدر بنی-اور جب وہ سست ہوگئے اور
تحکیم و ثالثی میں پڑے تو ہزیمت اٹھانا پڑی-وہ اہل
عراق سے کہتے رہے کہ شام پر بھرپور حملہ اور
شامیوں سے فیصلہ کن جنگ ہی لڑائی کا توازن ان
کے حق میں کرے گی-مگر اہل عراق سستی کرتے
گئے-تو یہ فوجی حکمت عملی کی ناکامی نہ تھی

میں ان ماہرین تاریخ پر حیران ہوتا ہوں کہ جو
صہونیت اور کالونیل سامراجیت کی منافقانہ سامراجیت
کو منہ بھر کر گالی دیتے ہیں-مگر اس طرح کی چالوں
اور طرز سیاست کو دور علی میں ان کے مخالفین کے
تدبر اور سیاسی بصیرت سے تعبیر کرتے ہیں-حال کی
چانکیائی سیاست کی مذمت کرنے والے علی کے
زمانے میں اس طرز کی سیاست کی مدح سرائی کرتے

ہیں-علی کی سیاست اور فوجی حکمت عملی پر جب
بھی عمل ہوا نتائج بہتر نکلے-

علی کے مدمقابل اسلام میں ملوکیت،جاگیرداری،قبیل
داری کی بنیادیں رکھ کر گئے اور اسی بنیاد نے آگے
نوآبادیاتی غلامی اور سرمایہ داری نظام کو اسلامی
سماج میں جگہ بنانے کا موقعہ فراہم کیا-اور مفاہمت
سازی کے نام پر باطل پرستی یہیں سے داخل ہوئی-
فکر علی اس انحراف کے خلاف تھی-وہ ایسے ہر نظام
کے خلاف تھی جس سے طبقاتی خلیج پیدا ہوتی ہو اور
استحصال کا جواز سمانے آئے-

سرمایہ دارانہ نظام جس کی بنیاد محنت کی استعداد کو
خریدنے اور ورکنگ کلاس کی محنت کے اکثر ثمر کو
ہڑپ کرجانے اور دولت کے چند ہاتھوں میں جمع
ہوجانے جیسے مظاہر پر مشتمل ہے-یہ منڈی کی

معشیت اس نظام سے کہیں زیادہ گھناؤنا ہے جس کے
خلاے علی تلوار بدست ہوئے-آج کی علی شناسی کا
مطلب سرمایہ دارانہ نطام اور منڈی معشیت کے خلاف
-جدوجہد بنتا ہے

شب ضربت علی کرم اللہ وجہہ
رمضان کی اکیس تاریخ کو فجر کی نماز پڑھانے کے
لئے حضرت علی کوفہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے
اور جب صفیں سیدھی ہوگئیں اور امام امامت کے لئے
کھڑے ہوگئے تو ابن ملجم لعین نے تیز ہلاکت آفرین
زہر سے بھجھے خنجر سے جناب امام پر حملہ کرڈالا
اور آپ اس حملے میں شدید زخمی ہوئے اور انہی
زخموں نے آپ کی جاں لے لی-اس واقعہ سے قبل ایک
اور واقعہ بھی امام علی کی زندگی میں پیش آیا تھا-اور
وہ یہ تھا کہ خواب میں آپ کو امام الانبیاء آنحضرت
کی زیارت ہوئی تو آپ نے ان سے مسلمانوں کی
مخالفت اور مناققت کا شکوہ کیا تو آنحضرت نے فرمایا
کہ ان کے لئے برے انجام کی التماس کی جیسے تو آپ
نے موجودہ لوگوں کی جگہ اچھے لوگوں کی صحبت
اور موجودہ لوگوں کو برے حاکموں کی صحبت کی

التجا کی -اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ امام علی
کس قدر نالاں تھے-امام علی نے ضرب لگنے کے بعد
ایک فقرہ کہا تھا جو تاریخ میں موجود ہے کہ "فزت
برب الکعبہ "یہ عظیم الشان فقرہ تاریخ میں درج ہے-
اور امام علی کی کامیابی کا گواہ ہے-شب ضربت تک
جو لمحات امام کی زندگی میں آئے ان کا ایک مختصرا
سا جائزہ چند نکات کو واضح کرنے کے لئے بہت
ضروری ہے-تاکہ ہم جاں سکیں کہ امام کی زندگی میں
یہ شب کن مرحلوں سے گزر کر آئی تھی اور امام نے
کیوں کہا تھا کہ"رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا
"امام تیرہ رجب کو مکہ میں سب سے مقدس مقام کعبہ
میں پیدا ہوئے-اور ان کی زندگی میں انقلاب کیسے
برپا ہوا یہ جاننے کے لئے کچھ واقعات کا ذکر بہت
ضروری ہے-ایک مرتبہ گھر میں علی نے محمد اور
خدیجہ کو قیام،رکوع ،سجود کرتے دیکھا تو اپنی والدہ
سے پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے تو انھوں نے ان کو بتایا
کہ یہ خدا کی عبادت کر رہے ہیں-علی ان کے ساتھ
شریک ہوگئے-پھر ایک عفیف نامی شخص تھے وہ
مکہ آئے تو وہ حضور کے چچا عباس کے ساتھ بیت
اللہ کے سامنے بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک نوجوان
مرد،ایک عورت اور ایک بچہ وہاں آئے-مرد آگے

کھڑا ہوگیا اور عورت اور بچہ پیچھے کھڑے ہوگئے-
اور یہ تینوں قیام،رکوع،سجود کر رہے تھے تو عفیف
کو بہت حیرانی ہوئی اس نے پوچھا یہ کیا تبدیلی ہے؟
تو عباس کہنے لگے نوجوان میرا بھتیجا محمد ہے-جو
کہتا ہے کہ وہ نبی ہے-اور ایک خدا کی عبادت کی
دعوت دیتا ہے-جبکہ عورت اس کی بیوی خدیجہ ہے-
اور بچہ میرا دوسرا بھتیجا ابو طالب کا بیٹا علی ہے-
اس وقت ان تین کے سوا دنیا میں کوئی اور اس دین پر
قائم نہیں ہے-ایک اور واقعہ کہ حضور اکرم کوہ ندا پر
تشریف لے گئے اور اس وقت ان کے سامنے چالیس
افراد قریش کے موجود تھے-ان میں ابو جھل،ابو
لھب ،ابی طالب ،عباس بھی موجود تھے-آپ نے ان کو
کہا کہ کہ "میں تم کو خدائے واحد پر ایمان لانے اور
شرک ترک کردینے اور مجھے رسول تسلیم کرنے اور
اس پیغام کو پھیلانے میں اپنا معاون بننے کی دعوت
دیتا ہوں"اس پر سب خاموش رہے صرف حضرت علی
کی ذات تھی جو اس وقت بہت کم سن تھے-اور
جسمانی لحاظ سے بھی کمزور تھے-بیمار بھی تھے-
انھوں نے خود کو پیغمبر کے معاون کے طور پر خود
کو پیش کر دیا-پیغمبر نے جب دیکھا کہ کوئی نہیں
اٹھتا تو علی کو گلے سے لگایا اور کہا تم آج سے

میرے بھائی اور میرے وارث ہو-امام علی کی والدہ
فاطمہ بنت اسد نے محمد کو اس وقت پلا اور پوسا تھا
جب ان کی والدہ آمنہ کا انتقال ہوگیا تھا-جس وقت علی
پیدا ہوئے تو آپ نے اور خدیجہ نے علی کی پرورش
اور تربیت کا ذمہ لے لیا-اس لئے بچپن سے آپ نے
سایہ مہبت نبوت و وحی میں پرورش پائی-اور پھر
محمد اور علی کے درمیان رشتہ اخوت و وصی جو
کوہ ندا سے قائم ہوا تھا ساری زندگی قائم رہا-بنو ہاشم
میں ابی طالب کا گھر اور محمد کا گھر ہی عرب کے
اندر آنے والے انقلاب کی تحریک کا مرکز بن گیا تھا-
رسول نے علی کو بستر رسول پر سلایا اور پھر جب
علی ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مواخات کے
موقعہ پر ان کا رشتہ اخوت کسی انصاری سے
جوڑنے کی بجائے اپنے ساتھ جوڑا-یہ ایک طرح سے
اس عہد کی ایک مرتبہ پھر سے تجدید تھی جو امام
علی سے محمد نے کوہ ندا پر کیا تھا-پیغمبر اسلام نے
اس عہد کی تجدید اور مسلمانوں کو اس کی یاد دہانی
وقفے وقفے سے بار بار کرائی-تاریخ ہمیں مختلف
جگہوں پر اس کی بعض گشت سناتی ہے-اگر آپ مدینہ
میں آنے کے بعد سترہ رمضان کو پیش آنے والے بدر
کے واقعہ کو دیکھیں تو اس موقعہ پر پیغمبر نے سیاہ

علم علی کو دیا جو لشکر کے آگے لیکر اس کو چل
رہے تھے-پہلا وار کرنے علی کو حمزہ اور عبیدہ کے
ساتھ بھیجا اور پھر جنگ احد میں علی تھے جو سینہ
سپر ہوکر ڈٹے رہے تھے-خیبر کے موقعہ پر آپ نے
کہا کہ"کل علم اس کو ملے گا جو محب و محبوب خدا
و رسول ہے"اسی طرح سے جنگ تبوک کے موقعہ پر
جب آپ کو مدینہ کا والی بنایا تو آپ کی اداسی دیکھ کر
ایک بہت معروف جملہ اپنے اور علی کے درمیان تلق
بارے کہا "علی تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے
موسیٰ کے لئے ہارون تھے مگر مئی بعد کوئی نبی
نہیں ہے"یہ بھی اسی احد کی بعض گشت تھی-اسی
طرح سے یمن کا گورنر بنایا تو وہاں اسلام کی اشاعت
میں آپ کو کامیابی ملی جانے سے قبل جب آپ پیغمبر
ع ملے تو آپ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیغمبر نے جو
جملے کہے تھے وہ بھی اسی عہد کی بعض گشت
تھے-اس سے قبل محمد نے بنی نجران کے مسیحیوں
کو مباہلہ کی دعوت دیتے وقت جن کو اپنے اہل بیت
کے طور پر سامنے لائے ان میں علی موجود تھے-پھر
آل عبا میں بھی ان کو شامل کیا-اسی طرح اپنی بیٹی
فاطمہ کا نکاح کرتے وقت بھی آپ نے اسی طرف ایک
اشارہ کیا تھا-اور پھر یمن میں آپ کی حکومت کے

دنوں میں آپ کے عمل پر تنقید کرنے والے لوگوں کو
آپ نے غدیر میں خم کے مقام پر لوگوں کو جمع کر لیا
اور ان سے سوال کی تھا "لوگوں تمھاری جانوں کے
سب سے زیادہ کون قریب ہے ؟سب نے جواب دیا کہ
"آپ "تو آپ نے کہا کہ میں تم سب کا مولا ہوں تو علی
بھی تم سب کے مولا ہیں "جو علی سے عداوت کرے
اللہ تو بھی اس کو دور کر اور میں بھی اس کو دور
رکھتا ہوں "اسی طرح خود قران میں محمد کو یہ تلقین
کی گئی کہ "آپ فرمائیے!میں تم سے صلہ میں صرف
اپنے اقربا کی مودت مانگتا ہوں"پھر آپ نے حج سے
واپسی پر تمام مسلمانوں کو جمع کیا-اور ان کو کہا کہ
"میں تم میں ثقلین چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور
دوسری عترت "دونوں کو تھامے رہنا کبھی گمراہ نہیں
ہوں گے"پھر آپ جب بیمار ہوئے-بخار بہت شدید
ہوگیا-تو عباس نے علی سے کہا کہ میں بنو عبد
المطلب میں موت کے وقت نمودار ہونے والی علامات
سے واقف ہوں اور محمد میں بھی ان کو دیکھ رہا ہوں
تو آپ ان سے اپنی نیابت کا واضح پیغام لے لیجئے-
لیکن علی نے آپ کی مرض کی شدت کو دیکھتے
ہوئے مناسب خیال نہ کیا-لیکن جب خود رسول کی
طبعیت میں افاقہ ہوا تو آپ نے قلم اور قرطاس لانے

کو کہا اور یہ کہا کہ وہ ایسی وصیت لکھنا چاہتے ہیں
کہ بعد میں جھگڑا نہ ہو-اس موقعہ پر جو کچھ ہوا وہ
تاریخ میں درج ہے-پھر آپ نے اہل بیت کو کہا کہ وہ
آپ کی تکفین و تدفین اور نمازہ جنازہ کا اہتمام کریں
گے-آپ نے علی کو باب علم نبی قرار دیا تھا-یہ سب
دراصل کوہ ندا پر کئے ہوئے عہد کی بعض گشت
تھی-اور دیکھنا یہ چاہیے کہ امام علی جو پیغمبر کی
خلافت اور نیابت اور وصی ہونے کے جو دعویدار
تھے اس کے لئے انھوں نے مختلف موقعہ پر جو دلائل
دیے تھے وہ سارے تقریبا یہی تھے جو میں نے درج
کر ڈالے ہیں-تاریخ میں درج واقعات سے پتہ چلتا ہے
کہ آپ نے ابو بکر کی طرف سے جب آپ کو مسجد
نبوی میں بلایا گیا تو آپ نے وہاں آنے سے انکار نہیں
کیا-آپ گئے اور جب ابو بکر نے اپنی خلافت کو تسلیم
کرنے کو کہا تو آپ نے ابو بکر کو خدا کی قسم دے
کر پوچھا کہ وہ بتائیں کے قریش میں کو علم،فضل اور
قربت میں حضور کے ساتھ سب سے زیادہ نسبت
رکھتے ہیں ہیں؟آپ کا اشارہ بنو ہاشم کی طرف تھا اور
پھر آپ نے یہ بھی سوال کیا کہ بنو ہاشم میں کون سب
سے زیادہ پیغمبر کے قریب ہیں تو آپ نے پھر اہل بیت
کا ذکر کیا اور اس کے بعد اہل میں اپنی فضیلت کی

بات کی-اسی ملاقات میں علی نے عمر ،عبیدہ بن جراح
سمیت دیگر جید صحابہ سے یہ بھی سوال کیا کہ پوری
اسلامی تحریک میں کوئی ان کا مد مقابل ہے؟کسی کو
سبقت اسلام میں.علمی نبوی سے فسیز یاب ہونے
میں،عسکری معرکوں میں داد شجاعت دینے میں اور
دیگر پھلوں میں اہل بیت اور ان سے زیادہ سبقت
حاصل ہے؟تاریخ بتاتی ہے کہ ان سوالوں کا دوسرے
لوگوں پر یہی جواب تھا کہ ہاں آپ ٹھیک خطے ہیں
لیکن آپ سقیفہ بنو سعد میں اگر آجاتے تو آپ خلیفہ
ہوتے-کسی کے پاس دوسری دلیل نہیں تھی-آپ نے
عمر کی نامزدگی کے موقعہ پر بھی انہی عہد اور
وعدوں کو گنوایا تھا-پھر عبد الرحمان بن عوف سے
شورائی اجلاس میں آپ کا جو مکالمہ ہوا اور اس کے
بعد آپ نے مہاجر اور انصار کے مجمع سے جو
خطاب کیا اس میں بھی انہی بنیادوں پر اپنے خطاب
کی بنیاد رکھی-اور آپ نے اس موقعہ پر ایک تاریخی
جملہ یہ بھی کہا تھا کہ"یہ پہلا ظلم نہیں ہے جو تم نے
ہم پر روا رکھا ہے"آپ کا یہ بھی کہنا تھا "رسول کی
وفات کے بعد آپ مسلسل مصائب اور الم کا شکار
ہیں"میں اپنی گفتگو کو زیادہ طول نہیں دوں گا اور نہ
ہی موضوع سے ہٹنا چاہوں گا-ضربت کی شب ایک دن

میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کو پیدا کرنے کے اسباب
وصال نبی کے فوری بعد سے پیدا ہونا شروع ہوگئے
تھے-علی مسلم سماج میں ایک سخت نقاد کا کام کر
رہے تھے-وفات نبی کے بعد عرب کے اندر عمومی
طور پر اور مدینہ کے اندر خصوصی طور پر جو
انتشار اور اختلاف سامنے آیا تھا علی نے یہ نہیں کیا
تھا کہ اس حوالے سے جو طاقت ور لوگ غلط راستے
پر چل پڑے تھے ان کی طاقت اور ان کے غلبے سے
دب کر یا لالچ میں آکر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے-آپ
نے یہ بھی نہیں کیا کہ ان کا ساتھ دینے لگ جاتے جو
نئے نئے اسلام میں تلوار کے خطرے سے بچنے کے
لئے داخل ہوگئے تھے اور نسلی ،گروہی بنیادوں پر
اسلام کے تصور مساوات کو زک پہنچانا چاہتے تھے-
آپ نے یہ نہیں کیا کہ رسول کی میت کو چھوڑ چار
سقیفہ میں چلے گئے-حالنکہ عباس نے آپ کو یہ
مشورہ بھی دیا تھا-آپ نے یہ بھی نہیں کیا کہ سقیفہ
میں ہونے والے فیصلے کی غلطی کو چھپا لیا ہو اور
اس کو کارنامہ بتلایا ہو-آپ نے یہ بھی نہیں کیا کہ یو
سفیان جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر قصر اسلام کو
ڈھانے کی ٹھان لی ہو-خوں ریزی یا فتنہ انگیزی چاہی
ہو-آپ نے ناحق اور غیر مستحق کو حق اور مستحق

تسلیم نہیں کیا-اور پھر آپ نے بنو امیہ کے فتنے کو
تاریک اور تاریک گر کہا تھا-اور آپ کی دور بیں
نگاہوں نے تاریک و تاریک گروں کے ان لوگوں اور
ان کی اولاد کے ساتھ اتحاد کو بھی دیکھ لیا تھا جو
سقیفہ بنو سعد میں آپ کے حق کو غصب کرنے کا
سبب بنے تھے-اور اس سارے عمل سے اسلام کو جو
نقصانات ہورہے تھے ان کی نشان دہی سے آپ نے
کبھی گریز نہیں کیا-یہ بحران اور خرابی دور عثمان
کے ہاتھوں اس قادر شدید ہوگیا اور بنو امیہ ،آل مروان
اس قدر غالب ترک گر ہوگئے کہ آپ کو بھی میدان
عمل میں آنا پڑا-اس موقعہ پر بھی علی نے انتشار اور
فتنہ کی رہ کے ذریعہ اپنے اقتدار کی رہ ہموار کرنے
کی بجائے اصلاح اور اور باغیوں اور قصر خلافت
کے درمیان تصفیہ کرانے کی کوشش کی-آپ نے
عثمان کو بنو امیہ اور آل مروان کے چنگل سے
نکالنے کی کوشش کی-لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں
ہوئی بلکہ آپ کو اس سارے قضیہ کا ذمہ دار ٹھہرا دیا
-جب بنو امیہ کا فتنہ پوری طرح سے سامنے آگیا اور
اس فتنے سے انقلاب کے جملہ ثمرات کے فنا ہوجانے
کا خطرہ سامنے آیا تو اب علی صرف نقاد نہیں رہے
اور انھوں نے مصلح کا کردار تک محدود رہنا پسند

نہیں کیا-اب وہ میدان عمل میں آگئے-آپ نے ان سب
کرداروں کو بے نقاب کیا جو دولت،امارت اور
حکمرانی کی لالچ میں فتنے کی آگ کو بھڑکا رہے
تھے-اور علی نے صحیح ادراک کر لیا تھا کہ فتنے کا
مرکز شام ہے-اس لئے اس شام میں ظالموں کی
حکومت کے خاتمے کے لئے آپ نے آخر تک اہل
کوفہ کو تلقین کی کہ وہ جہاد کے لئے چلیں-جنگ
صفین کے بعد آپ نے بہت کوشش کی تھی-لیکن
معاویہ کی چالوں کی وجہ سے علی کو خود عراق میں
خوارج کے فتنے کا سامنا تھا-علی کو خوب اندازہ تھا
کہ کس طرح مہاجر صحابہ اور انصار صحابہ اور ان
کی اولاد میں سے اکثر لوگ اس تاریک گر فتنے کے
مقابلے میں کھڑے ہونے کی بجائے گھر میں گوشہ
نشین ہوگئے-کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اتنے
بڑے ناموں نے بنو امیہ کی فتنہ گری اور علی کے
جہاد کو ایک پلڑے میں تولا اور خود جاکر گوشہ نشین
ہوگئے-لیکن جب عمار بن یاسر قتل ہوئے تو سب کے
سامنے حقیقت کھل گئی تھی-کیونکہ پیغمبر نے پیشن
گوئی کی تھی کہ عمار کو ایک باغی ،سرکش ،گمراہ
گروہ قتل کرے گا "لیکن پھر بھی غیر جانب داری کی
روش جاری رکھی گئی-اور امام علی کی تنہائی میں

اضافہ کیا جاتا رہا-امام علی نے ایرانیوں کے ساتھ جس
شفقت کا اظہار کیا تھا اور انھوں نے نومسلم پارسی
ہرمزان کے قتل کی جو مذمت کی تھی اس سے بھی وہ
سارے لوگ ناخوش تھے جو اسلام کے نام پر عربیت
کو نافذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اور ناجائز
مراعات ہتھیانا چاہتے تھے-وصال نبی کے بعد سے
علی کی ذات کو نشانہ بنانے کا ج سلسلہ شروع ہوا تھا
اس کو عروج شامیوں نے دے ڈالا تھا اور پھر علی کی
کردار کشی کی انتہا کر دی گئی تھی-اس کردار کشی
کی مہم کا ایک نتیجہ خارجیت کا ظہور تھ-اور اسی
خارجیت نے علی پر مسجد کے اندر حملہ کیا تھا-و یہ
حملہ اس وقت ہوا تھا جب کوفہ کے اندر علی اور ان
کے ساتھی شامیوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کی
تیاری کر رہے تھے-چالیس ہجری کے سال یہ تیاریاں
بہت زور و شور سے جاری تھیں کہ ابن ملجم خارجی
کے زہر آلود خنجر کا شکار امام علی ہوگئے-آپ نے
اس سے پہلے مسلم سماج کو ،اہل کوفہ کو خبردار کیا
تھا سارے دشمن یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر علی کو
راستہ سے ہٹا دیا جائے تو ان کا رستہ صاف ہوجائے
گا اور وہ آسانی کے ساتھ اہل عراق کو فتح کرسکیں
گے-آپ نے نو مسلم آبادی کو بھی عرب سامراجیت

کے خطرات سے آگاہ کیا تھا-ان کو بتایا تھا کہ بنو امیہ
والے شامی قبائلی سرداروں اور پرانی سردار اشرافیہ
کے ساتھ ملکر ان کے خلاف غدر برپا کردیں گے-علی
کو یہ بھی اندازہ تھا تھا کہ نئے انقلاب کو مسمار کرے
کے لئے خود پرانی قیصر و کسرا کی لابی کیا کر
سکتی ہے؟شب ضربت انھی دو قسم کے فتنوں کے
عروج کے آغاز کی خبر تھی-آپ کو یہ بھی پتہ تھا کہ
ان دو فتنوں میں سب سے زیادہ جبرف اور ظلم کا
نشانہ اہل بیت اور ان کے سچے پیرو بنیں گے-میثم
کے ساتھ ہونے والے سلوک کی خبر علی نے خود دے
ڈالی تھی-حجر بن عدی اور ان کے دیگر ساتھیوں کے
ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا-پھر اہل کوفہ سے جو بھی سلوک
روا رکھا گیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے-شب ضربت کا
المیہ کربلا کے المیہ کی درمیانی کڑی تھی-اور اس
کی سابق کڑی فاطمہ کی وفات اور پہلی کڑی خود
وصال رسول تھا-اس دوران حسن کی شہادت بھی ایک
کڑی تھی-اور یہ سب اس لئے ہوا کہ علی اور ان کے
خاندان نے کسی بھی طرح باطل اور اس کے حامیوں
سے سمجھوتہ نہیں کیا-منافقت کو قریب بھی نہیں آنے
دیا-اربوں کے ہاں جس کو تدبر ،دانائی اور دانش مندی
کہا جاتا ہے اور جس کے لئے مغیرہ بن شعبہ ،زیاد بن

ابیہ جیسے لوگ معروف تھے یا اس وقت کے بدوی یا حضری قبائل کے سردار جس سے متصف کئے جاتے تھے وہ صرف یہ تھی کے آپ نے طاقت ،حکومت ،لوگوں کو غلام بنانا ہے ور یہ سب کرنے کے لے جو بھی کرنا پڑے ٹھیک ہے-اس میں ٹھیک یا غلط کی پہچان کرنا ضروری نہیں ہے-پھر ان کے ہاں حساب و کتاب بھی حسب نسب دیکھ کر کیا جاتا تھا-لیکن علی کے ہاں دانش ،عقلمندی ،علم کے معنی وہ تھ جو مکتب نبوی نے متعین کئے تھے-اس لئے علی نفسانیت اور لالچ سے بھرے اس سماج میں اجنبی بن کر رہ گئے- اور ان کے ساتھیوں کو بھی اس اجنبیت اور بیگانگی کا سامنا کرنا پڑا-لیکن ان کی تمام تر اجنبیت و بیگانگی کے ان کا اس سماج میں موجود ہونا بھی باطل کو گوارہ نہیں تھا-پھر جب ظاہری وجود کو موت سے ہمکنار کیا گیا تو بنو امیہ سمیت علی کے دشمن علی کی قبر کا نام و نشان مٹانا چاہتے تھے تو قبر علی پشدہ رکھی گئی-لیکن پھر علی کا نام لینا سزا کا مستوجب ٹھہر گیا-اب یہ حکمت عملی اپنائی گئی کہ آپ اور آپ کے اہل بیت کے خلاف زبردست مہم کردار کشی کی چلی جائے اور جو ماثر نہیں تھے ان کو معتبر بنا دیا جائے-میں تاب قلم نہیں رکھتا کہ ان باتوں کو قلم بند

کروں مگر جس کو شوق ہو اس سما کی تصویر
دیکھنے کا اس کو تاریخ کی کتب ضرور دیکھنی
چاہیں-خاص طور پر عبد الحسین شرف الدین موسوی
جو کہ موسیٰ کاظم کی اولاد سے تھے انھوں نے اس
حوالے سے کافی مستند کام کیا ہے-شب ضربت ایک
غم و اندوہ کا دن بھی ہے-اور اس دن کو علی نے اپنے
لئے نجات اور کامیابی کا دن بھی قرار دیا-انسان کی
کامیابی کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہ ضمیر کے
اتنان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہورہا ہو-کل یوم شہدت
علی ہے-اور اس دن کو سوگ،غم،ماتم گساری اور امام
کی ذات کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کے اجتماع
کا دن بھی ہے-لیکن اس دن دنیا بھر کے خارجی اور
ظالموں کے ساتھی اپنی بربریت کا ثبوت بھی پیش
کرتے ہیں-کربلا پر حملے کرنا معمول ہے-علی کے
ماتمی جلوسوں کو نشانہ بنانے کی کوشش بھی ہوتی
ہے-القائدہ نجف اشرف میں امام علی کی قبر ،شام میں
بی بی زیب کے مزار کو اپنا سب سے بڑا ہدف قرار
دے چکی ہے-جبکہ ایران میں امام علی رضا کا مزار
ہدف ہے اور مکہ اور مدینہ میں بنو ہاشم اور اہل بیت
کی بشمول فاطمہ ،حسن،امام علی بن حسین کے
مزارات کو مسمار اور قبروں کے نشان کو مٹایا

جاچکا-پھر تاریخ کی کتب سے علی اور اہل بیت کے
کردار کو نکالے جانے کی کوشش بھی عروج پر ہے-
سعودیہ عرب میں کتابوں میں تحریف کا کام عروج پر
ہے-گویا انقلاب کی جملہ ثقافتی اور تاریخی نشانیوں کو
مٹانے کا کام جاری ہے-ہے نہ کتنی عجیب بات کہ بنو
امیہ کا تاریک و تاریک گر فتنہ نسل در نسل سفر کر
رہا ہے اور یہ ابھی تک گالی،تشدد ،دشت گردی ،خوں
ریزی اور تباہی پر یقین کرتا ہے-یہ تاریخ کو جلانا
چاہتا ہے-ثقافت کو مٹانا چاہتا ہے-اور عمارتوں کو
گرانا چاہتا ہے-شب ضربت علی کو گریہ کرنے والوں
اور ماتم کرنے والوں کو اس حیلہ گری اور اموی
سیاست کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے-اور فکر و
روش امام علی سے رہنمائی لینے کی ضرورت بھی
ہے-تاکہ آخری وقت قریب آئے تو آپ بھی کہہ سکیں
"فزت برب الکعبہ

غدیر خم سے کربلا تک

آج جب میں یہ سطور ٹائپ کررہا ہوں تو مجھے بہت
سارے پیغامات موصول ہورہے ہیں کہ عید غدیر خم
مبارک ہو-آج کے دن غدیر خم کے مقام پر ایک ایسا
اجتماع ہوا تھا جس کی مسلمانوں کے اندر شیعہ مسلک

کے ہاں بہت اہمیت ہے-وہ اس دن کو عید غدیر کے
طور پر مناتے ہیں-یہ بلکل اسی طرح سے عید ہے
جیسے بریلوی حضرت عید میلاد مناتے ہیں-شیعہ
مسلمز کے مجھے پیغامات موصول ہورہے ہیں اور
میں ہر پیغام کے جواب میں ان سب کو ایک سوال بھیج
رہا ہوں-سوال یہ ہے کہ جس دن کو آپ لوگ عید کا دن
قرار دیتے ہو اس دن جو واقعہ رونما ہوا اس کا
انسانوں کی اجتماعی زندگی سے کیا تعلق بنتا ہے؟اور
اس دن جو پیغام پیغمبر نے ابلاغ رسالت کے طور پر
دیا اس کا اس سماج کی زندگی سے کیا تعلق بنتا ہے؟
میں جب بھی یہ سوال جوابی میسج کے طور پر بھیجتا
ہوں تو اکثر مجھے جواب ملتا ہے کہ آپ کا مطلب کیا
ہے؟کیا کسی واقعہ کا اجتماعی زندگی کے لئے کوئی
معنی رکھنا ضروری ہوتا ہے؟میں یہ سوال کے جواب
میں سوال پڑھ کر اندازہ کرلیتا ہوں کہ ہم سوچ و بچار
سے کس قدر دور ہیں-
میں اپنے سوال کی پرتوں کو اور تہہ داری کو کھولوں
اس سے پہلے آپ کو یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ ہوا
کیا تھا اس دن-غدیر خم کے مقام پر پیغمبر اسلام نے
اپنے ساتھیوں کے ایک بہت بڑے اجتماع میں کہا تھا
کہ"لوگو!کون ہے جو تمہاری جانوں کے سب سے

زیادہ قریب ہے؟تو لوگوں نے بیک زبان ہوکر کہا کہ
آپ!تو آپ نے کہا کہ پھر علی بھی آپ کے قریب ہیں
اور جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے-جو
علی سے عدوات رکھتا ہے وہ گویا اللہ اور رسول سے
عداوت رکھتا ہے "اس موقعہ پر علی کو وہاں پر
موجود سب لوگوں نے مبارک باد دی تھی-اور یہ غدیر
خم کے مقام پر خطبہ کا دن عید قرار پاگیا-اگر اس کو
ایک رمز اور اشارہ کے طور پر دیکھا جائے تو صاف
سمجھ آتا ہے کہ غدیر خم کے مقام پر پیغمبر اسلام نے
اپنے ساتھیوں کو نوید سنائی تھی کہ ان کے بعد بھی
سیاست عدل جاری رہے گی-اور عدل کا بہت گہرا
تعلق ہے رہبری کے ساتھ،امامت کے ساتھ اور لیڈ
کرنے ساتھ-اب دیکھئے کہ خود پیغمبر نے اپنے آخری
خطبہ میں جو ارشادات فرمائے تھے ان میں بھی عدل
اور برابری اور انصاف بہت زور تھا-پھر جب مدینہ
میں ایک اور اجتماع رسول نے کیا اور کہا اتا ہے کہ
پیغمبر کی زندگی کا یہ آخری اجتماع تھا اور خطبہ
بھی اس کے بعد رسول مرض الموت میں مبتلا ہوئے
-اور وصال کر گئے

دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہو کہ تم ایک دوسرے کی"
گردنیں مارنے لگو،تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جارہا

ہوں ایک کتاب دوسری عترت دونوں کو تھامے رکھنا
"یہاں تک کہ ہماری ملقات حوض کوثر پر ہو
اس میں بھی رمز ہے کہ عدل اور امن دونوں کا ساتھ
عادل اور مومن کی رہبری سے ممکن ہے-اب آجائیے
خود اس صاحب کی طرف جس کو مقام غدیر خم میں
نوازا گیا-وہ کیا کہتا ہے ؟

العدل افضل السیاستین

جمال السیاست الدل فی الامر

خیر السیاسات العدل

ملاک السیاست العدل

علی کے نزدیک سیاست ،رہبری اور اصلاح کا مطلب
عدل ہوتا ہے اور برابری ہوتا ہے-میں اکثر اپنے شیعہ
برادرز کی مجلس اور جلوس میں جاؤں تو مجھے ان
کے ہاں ایک فقرہ بہت سننے کو ملتا ہے"علی کا طرز
زندگی منافقت کی موت ہے"میں یہ فقرہ دیکھ کر پھر
سے اپنے شیعہ بھائیوں اور بہنوں کی زندگیوں کی
طرف غور سے دیکھنے لگتا ہوں اور مجھے احساس
ہوتا ہے کہ ان کی زندگیوں میں عدل،انصاف اور امن
کی وہ اہمیت تو ہرگز نہیں ہے جو علی کے ہاں مجھے
نظر اتی ہے-

من حق الملک ان یسوس نفسه قبل رعیة

"حاکم کو عوام سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے"
علی کہتے ہیں کہ ان کو عیاری ،چالاکی اور موقعہ
پرستی سے نفرت ہے-اور ان
چیزوں سے محبت کا نام لوگوں نے تدبر اور دانائی
رکھ ڈالا تھا-لوگ الی کو اس طرح کے تدبر اور دانائی
سے خود کو نہ لتھڑنے کی وجہ سے ناکام قرار دیتے
تھے-اور اس طرح کی روش اختیار نہ کرنے کے سبب
علی تنہا ہوئے تھے-یہ تنہائی پھر علی سے سفر کرتی
ہوئی امام حسن تک آئی اور ان کو زہر پینا پڑا اور
جگر خوں ہوتے دیکھنا پڑا -پھر آگے امام حسین اور
ان کے ساتھ جب رہبری اور عدل کو ساتھ ساتھ رکھنے
پر مصر ہوئے اور رہبری و عدل کو ساتھ ساتھ رکھنے
کا درس دینے کے لئے حسین کو وہیں جانا پر جہاں
سے وہ اپنے بابا کو واپس مدینہ چلے آنے کو کہتے
تھے-مگر الی نہیں آئے تھے اور ان کو ایک ایسے
آدمی نے زہر سے بھجی تلوار سے گھائل کیا تھا جو
خود کو بہت بڑا موحد خیال کرتا تھا ور الحکم للہ کا
جھنڈا اٹھائے پھرتا تھا-جب حسن نے امن کا جھنڈا بلند
کیا اور اپنے اصحاب کی گردنوں پر تلوار چلنے سے
بچانے کی کوشش کی اور مدینہ لوٹ آئے تو انھوں نے
دیکھا کہ مدینہ کا ہر باسی زبان حال سے یہ کہتا تھا

مجھے بھی اپنے مدینہ میں زندہ رہنا ہے
مجھے بھی رکھنی پڑے گی منافقوں کے ساتھ
مگر حسن اور ان کے اہل کہاں زندگی کومنافقت کے
ساتھ بتا سکتے تھے-وہ گئے تو پھر مدینہ میں ظلم اور
جوڑ کے کارندے آگئے اب بات منافقت سے آگے
سیدھا سیدھا ظلم اور جبر کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور
مال کی ،دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو مان لینے کی
تھی-حسین منافقت زدہ ہونے کی بجائے نکلے اور یہ
امید کی کہ شائد اہل عراق کو عدل کے ساتھ رہبری
والی بات پر یقین آگیا ہو-لیکن کربلا کے میدان میں
-رہبری کو عدل کے ساتھ جوڑنے کا انجام سامنے آگیا
اور ایک بیمار عابد کے سوا گھر کے سارے رجال و
صغار چلے گئے-لیکن عدل کو رہبری کی شرط ماننے
والے گروہ میں علم زینب کے ہاتھ آگیا جو دمشق میں
وہ علم ایک بیمار نوجوان کے ہاتھ میں دیکر وہیں خاک
میں سوگئیں-اور سیاہ و سرخ علم لئے سراپا احتجاج و
سوگ و انقلاب و مزاحمت و تحریک بنے وہ بیمار
مدینہ چلا آیا اور پھر ایک لمبے عرصۂ تک عبادت اور
ریاضت کے استعاروں کو رہبری اور عدل کے ساتھ
ایسے کمال سے جوڑا کہ ظلم و جور کے ساتھ رہبری
کے لباس میں رہزنی کرنے والے خوف اور اندیشوں

سے مرے جاتے تھے-رمز اور استعاروں کو انقلابی
روپ دینا کوئی آسان بات تو نہیں ہوتی-سجدے کو بے
عملی کی بجائے مزاحمت کا معنی دینا کوئی آسان کام
نہیں ہوتا-فقہ کو رخصت کی بجائے عزیمت میں بدلنا
کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا-اور قید خانے میں طویل
قید کے دوران حجاز سے لیکر ہند تک لوگوں کا
محبوب ہوجانا بھی آسان امر نہیں ہوتا-کربلا سے مدینہ
اور وہاں سے کاظمین تک اور پھر مشہد اس بات کی
تصدیق زین کے سجدے کر سکتے ہیں.باقر کی
مجلس ہائے علمی کرسکتی ہے-جعفر کا فقہ کرسکتا
ہے-موسیٰ کا صبر کرسکتا ہے-اور رضا کی شہادت
کرسکتی ہے-ان سب نے عدل ،برابری اور رہبری کو
اپنی توحید سے ،رسالت سے کبھی الگ نہیں ہونے دیا
تھا-غدیر خم کے مقام پر مسرت کے لمحات تو بہت
-تھوڑے وقت تک کے لئے تھے

ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں
پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں

نہج البلاغہ اور شہر بانو

میں چودہ سال کا تھا جب پہلی مرتبہ میرا تعارف نہج
البلاغہ سے ہوا تھا-میرے ایک ماموں تھے جو سنی
العقیدہ تھے-حیدرآباد میں ان کا گھر تھا-میں گرمیوں

کی چھٹیوں میں ان کے گھر گزارا کرتا تھا-ان کے ہاں
ایک ریڈنگ روم تھا-ماموں رات کو بلاناغہ وہاں
مطالعہ کرتے تھے-میں بھی وہاں خاموشی سے جا تا
اور کسی بھی شیلف سے کتاب لیکر پڑھنے لگتا-ایک
رات میرے ہاتھ "نہج البلاغہ"لگی-عربی متن کے ساتھ
ترجمہ مفتی جعفر حسین کا تھا-اس کتاب کی مشکل
عبارت مجھے اپنے لئے ایک چیلنج سے کم نہیں
لگیں-تو میں نے بہت سا وقت اس کو سمجھنے میں
صرف کیا-میرے ماموں اگرچہ جماعت اسلامی کے
رکن تھے مگر وہ بھی اس کتاب کی بلاغت معانی کے
قائل تھے-ان گرمیوں میں نے ان کی مدد سے بہت حد
تک اس کتاب کے مندرجات تک رسائی حاصل کی-میں
بعد میں بھی اس کتاب سے لاتعلق نہیں ہوا-لیکن اس
کتاب میں میری دلچسپی اس کے سماجیاتی پہلوؤں سے
رہی-اس کی جو مابعد الطبعیات تھی اس سے میں دور
تھا-

میرے شہر کے پاس ایک قصبہ ہے-ایک دوست کی
شادی میں وہاں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں رات بھی
قیام ہوا-دوست کے گھر کے ایک گوشے میں کتابوں کا
ایک شیلف تھا-وہاں نہج البلاغہ موجود تھی-میں اس کو
پڑھنے لگا-اتنے میں ایک لڑکی وہاں داخل ہوئی اور

اس نے میرے ہاتھ میں نہج البلاغہ دیکھ کر کہا کہ
"صاحب کلمات نہج بہت تہہ دار تھے ان کی تہہ داری
کا ادراک کئے بنا یہ کتاب اپنا آپ کسی کے سامنے
"کھولتی نہیں ہے
میں اس کی بات سن کر چونک گیا-تعارف کے بعد
معلوم ہوا کہ نام شہر بانو ہے-فلسفہ کی استاد ہے-اس
نے بتایا کہ کیسے وہ تقابل ادیان کی سٹڈی کے دوران
-نہج البلاغہ سے روشناس ہوئی
-اس رات ہمارا جو مکالمہ ہوا وہ بھی بہت دلچسپ تھا
شہر بانو:نہج البلاغہ امام علی کے توحید،رسالت،آخرت
اور امامت جیسے تصورات کا رشتہ ان کے سماجی
تصورات سے سمجھنے کے سب سے اہم کتاب ہے-آپ
نے کبھی امام کے تصور عبادت پر غور کیا؟
حسینی:میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے علی کی میٹا
فزکس پر دھیان نہیں دیا-میری نظر ان کے سوشل
-کانسپٹس پر رہی ہے
شہر بانو:علی کی میٹا فزکس کو ان کی سوشل
آئیڈولوجی سے الگ نہیں کیا جاسکتا-بلکہ اول ان کی
-فکر کا مقدمہ ہے اور مؤخر اس کا نتیجہ ہے

علی کے میٹافزیکل آئیڈیاز سے ان کی سوشیالوجی کا جنم ہوتا ہے-رب-انسان-کائنات کی کون میں رب حقیقت مطلقہ ہے-وہ سب چیزوں کا منبع ہے-
علی جب توحید کے مطلق اور مجرد محض ہونے پر اصرار کرتے ہیں تو لوگوں کو یہ منطقی یا فلسفیانہ اپچ لگتا ہے-مگر یہ مجرد اور مطلق ہونا ہی آگے چل کر عدل محض کی قدر کو جنم دیتا ہے-اور خدا کی ذات اور صفات کی وحدت کا عکس عدل اور مساوات کی قدروں میں طبیاتی تصور بن جاتا ہے
حسینی:نہج البلاغہ کو ایسے دیکھنے کی بصیرت کیسے حاصل ہوئی ؟
شہر بانو:(مسکراتے ہوئے)اگر میں یہ کہوں اس تربیت کو پروں چڑھنے والی دو ہستیاں ہیں جو میرے خوابوں میں آکر مجھے درس حیات دیتی رہی ہیں-
(میں مسکرانے لگا)
شہر بانو:میں جانتی ہوں تم کیوں مسکرا رہے ہو،تمھارے ذہن میں سگمنڈ فرائڈ آیا ہوگا اور ان کی تعبیرات خواب کی تھیوری -
(میں اس کے زبردست قیافے پر حیران رہ گیا تھا)

میں امام علی اور بی بی زینب کو بچپن سے خوابوں
میں دیکھ رہی ہوں-لیکن جب میں ایم اے فلسفہ کر رہی
تھی تو سارتر کے فلسفۂ وجودیت کو پڑھتے پڑھتے
میں نہج البلاغہ کی طرف متوجہ ہوگئی -پھر جب بھی
رات کو نہج البلاغہ پڑھ کر سوتی تو خواب میں کبھی
مولا علی تو کبی بی بی زیب مقامات کی تشریح کرتے
دکھائی دیتے-سوکر اٹھتی تو اس تشریح کو نوٹس کی
شکل میں لکھ لیتی تھی-مجھے حیرت ہوتی کہ علی کی
میٹا فزکس کے بھید علی کی سماجیات میں کھلتے نظر
آتے تھے--علی کی زندگی کے کافی واقعات کی سمجھ
آنے لگی تھی-مجھے یہ راز بھی پتہ چل گیا کہ وہ
کیوں اپنے مشف کو ترتیب نزول سے مرتب کر رہے
تھے-علی قران اور تاریخ قران کو کیوں ایک ساتھ
رکھنا چاہتے تھے؟کیونکہ اسی سے جبر اور استحصال
کا رستہ رک سکتا تھا--علی کی میٹا فزکس اسی لئے
تو درباری قاضیوں اور مفتیوں سے الگ تھلگ تھی-
اور بنو امیہ والے اسی لئے مذہبیات کو سماجیات اور
قران کو تاریخ سے الگ کرنا چاہتے تھے-علی آگاہ
تھے کہ اگر توحید ،رسالت اور آخرت جیسے تصورات
کو سماجی اقدار عدل،انصاف ،مساوات سے الگ کر
-کے دیکھا گیا تو یہ صرف کلامی مسائل بن جائیں گے

یہ یادگار ملاقات تھی اگرچہ میں نے نہج البلاغہ کو
جدلیاتی مادیت سے ہٹ کر دیکھنا نہ چھوڑا مگر اتنا
کیا کہ اس میتھڈ کو میں نے اس کتاب میں بیان کئے
گئے میٹا فزیکل تصورات پر بھی اطلاق کیا اور نتائج
میں کوئی فرق نہیں آیا-شہر بانو سے ملاقاتیں رہیں-
اور میں نے بھی نہج البلاغہ سے "علی اور نظریہ
توحید "جیسا مضمون اخذ کیا-"شب ضربت علی "میں
بھی وہی بصیرت کام کر رہی تھی جو شہر بانو سے
-گفتگو کر کے حاصل ہوئی تھی

شہر بانو کی آواز میں سوز بھی بہت تھا-ایک رات اس
نے مجلس میں شام غریباں پر ایک مرثیہ سنایا تو ہر
-آنکھ اشک بار تھی

ایک مرتبہ ایران کی انقلاب سے قبل اور بعد ک مذہبی
علم میں تشکیل نو کے پروسس پر بات ہورہی تھی-میں
سروش کے لبرل اور سیکولر آئیڈیاز کے ساتھ اسلامی
خیالات کی مطابقت پذیری کرنے کی صلاحیت کی داد
دے رہا تھا تو شہر بانو نے مجھے یہ کہہ کر لاجواب
کر ڈالا

سروش نے بس اتنا کیا کہ علی شریعتی اور استاد"
مطہری سے قبل مذہبیت پر جو غیر سیاسی پن
طاری تھا اس کو مغربی لبرل فلاسفی کی مدد سے

واپس لانے کی کوشش کی-اس لئے اس کو آئدولوجی لفظ سے نفرت ہے اور اس نے کارل پاپر جیسے لوگوں کی راہ اسی لئے اپنائی تھی تاکہ وہ انقلاب کو پلٹ سکے-اس کے نظریات کا عملی فائدہ سامراجیوں کو ہوا -میں خاموش ہوگیا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا-

"بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی"

شہر بانو علم کا سمندر تھی-وہ بہت آسانی کے ساتھ اور آسان لفظوں میں سب سے مشکل مباحث آسان لفظوں میں بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی-دھان پان سی لڑکی تھی-مگر اس کا فکری وجود بہت بھاری بھر کم تھا-

میں فکر روزگار میں الجھ گیا تو اس سے ملاقات نہ ہوسکی-مگر ہر پندرہ دن بعد اس کا ایک خط ملتا تھا کیونکہ وہ برقی خط یا موبائل کا دور نہیں تھا-اس خط میں ان الجھنوں کا ذکر ہوتا تھا جن کو دوران تدریس فلسفہ وہ سلجھا رہی ہوتی تھی-میں نے اس کو کبھی ذاتی مسائل ڈسکس کرتے نہیں دیکھا تھا-

ایک مرتبہ اس کی والدہ کا فون آیا کہ شہر بانو آغا خان ہسپتال میں داخل ہے تمھیں یاد کرتی ہے آجاؤ-میں سب چھوڑ چھاڑ آغا خان ہسپتال کے کینسر وارد میں پہنچا

یہ نومبر کا آغاز تھا-میں اس کے بیڈ تک آیا تو شہر
بانو مزید سوکھ چکی تھی-زرد چہرہ تھا اور بہت
کمزور لگ رہی تھی-مگر آنکھوں میں چمک باقی
تھی-مجھے دیکھا تو چہرے پر رونق آئی اور لب
مسکان کی حد تک کھل گئے اور میرے قریب آنے پر
کہنے لگی
ایک میڈیکل رپورٹ آپ کے منصوبوں پر ایسے فل"
" سٹاپ لگاتی ہے
میں سنکر بولا فل سٹاپ کیوں کہتی ہو،عارضی تعطل
ہے-زندگی پھر رواں دوں ہوگی،میں اور تم پھر کتاب
زندگی کھولیں گے-تم بیان کرنا اور پھر اپنا کوئی
خواب دوہرانا ،میں مسکراؤں گا ،تم ہش!کہنا اور پھر
" کہنا "کیوں پھر فرائڈ یاد آیا
کہنے لگی !جو خواب میں آکر کتاب کے ابواب کے
مشکل مقام کو آسان کرتے تھے اب بھی آتے ہیں مگر
ارجع"کی صدا دیتے ہیں-اس لئے کہتی ہوں کتاب
زندگی کے آخری باب کی آخری سطر مکمل ہونے کو
-ہے اور بس فل سٹاپ لگانا ہے
میں نے خود کو ذرا بہادر دکھانے کی کوشش کی-اندر
سے میں ہل گیا تھا -میں نے کہا کہ یار !کچھ نہیں ہوگا

تمھیں اور میں نے مادیت پر ایک ہلکا سا لیکچر دے
مارا -لیکن وہ سنجیدہ رہی-اور کہا
تم مجھ پر جدلیاتی مادیت کے ہتھیار سے حملہ اور"
مت ہو،میری سماجیات میری میٹا فزکس کی دین ہے-
میں لطیف سے ثقیل کو اخذ کرتی ہوں-تم میری روح
کو عمل سے مت کاٹو-میری روح کا عمل سے کتنا
موت ہے-کسی کا دل مومن ہو اور دماغ کافر تو چلتا
ہے مگر اگر دماغ مومن ہو اور دل کافر تو نہیں چلتا-
تم دل کے مومن ہو اس لئے لوگ تمھارے دل کے ساتھ
-چلتے ہیں
شہر بانو پانچ نومبر کی شام کو جب سورج غروب
ہورہا تھا اس دنیا سے کینسر وارڈ کے بستر نمبر دس
پر خاموشی سے گزر گئی-آج پانچ نومبر ہے جب میں
یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور اس کو اپنی آنے والی کتاب
کا سب سے اول مضمون بنا رہا ہوں-شہر بانو عالم
مثال میں ہوگی (عالم لوگ تو یہی بتلاتے ہیں کہ کہ
مرنے کے بعد ایک اور حیات ہوا کرتی ہے جس کو
حیات برزخی کہتے ہیں کہ نیک روحیں جسم مثالی
کے ساتھ وہاں ہوتی ہیں-نیک روحوں کو اجازت ہوتی
ہے کہ وہ جسم مثالی کے ساتھ ایک ہی وقت میں کی
جگہوں پر حاضر ہوجائیں)میں آج بہت سی ایسی

تحریریں ہیں جن پر بہت داد وصول کرتا ہوں مگر کہہ
ضرور دیتا ہوں کہ کہ کہاں کہاں شہر بانو تمھاری
بصیرت کام کرتی ہے-میں نہج البلاغہ کھولوں تو ہر
ورق پر ہر جملے پر تم آکر بیٹھ جاتی ہو-کتاب تمہارا
عکس دکھاتی ہے اور تمھاری بصیرت کے آئینہ میں
-کتاب کے بھید کھلنا شروع ہوجاتے ہیں
خدا را رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(کنکریاں(افسانہ

بیٹا!یہ جدہ ہے یہاں سے ہم احرام باندھیں گے اور پھر
اپنے مقدس ترین سفر کا آغاز کردیں گے-میرے بابا
کی آواز میرے کان میں پڑی تو میں چونک گیا-اس
سے قبل جدہ کی دور سے نطر آتی بلند و بالا عمارتین
دیکھ کر مجھ پر ایک عجب طرج کب ہیبت طاری
تھی-مین سوچ رہا تھا کہ یہ تو وہ حجاز نہیں ہے جس
کا تذکرہ فلپ کے ہیٹی نے اپنی کتاب "دی عرب"میں
کیا تھا-اور جب میں عدبی ادب میں ڈاکٹریٹ کررہا تھا
تھا تو اس دوران عربوں کی متداول کتب مین جس

حجاز کا نقشہ کھینچا گیا تھا یہ وہ بھی نہیں تھا-مجھے
اب تک یہ بھی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میرے بابا نے
بحری سفر کیوں اختیار کیا تھا؟مین نے اچانک بابا سے
پوچھا کہ بابا جانی! ہم ہوائی سفر اختیار کرتے تو بہت
آرام سے پہنچتے -تو بابا جو کہ سفید براق احرام میں
لپٹے ہوئے تھے مجھے کہنے لگے بیٹا!تمہارے دادا
بھی سفینہ عابد سے حج کرنے آئے تھے-میں نے کہا
بابا مجھے تھوڑا تھوڑا تو یار ہے-دادا اور دادی کے
حج پر جانے کا واقعہ-بابا نہ جانے کس خیال میں
تھے-اچانک ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ جب
تمہارے دادا اور دادی نے اچانک حج پن جانے کا
اعلان کیا تھا تو پڑوس میں رہنے والے مرزا انور اور
ان کی بیگم گھر آکر کہنے لگے کہ
نقی صاحب اور زہرہ جی ! آپ کو اللہ کے گھر جانے
کی مبارک باد دینے کو من نہیں کرتا-بھلا دو ناستک
وہاں کیا کرنے جارہے ہیں-لیکن آپ کی اشتراکیت کا
بھی کیا کہنا-گھر میں ہندؤ جوہری کی باقیات سنبھالتے
پھرتے ہو--لکشمی مینشن نام کو مٹنے نہیں دیتے-اور
پھر گھر پر عاشور کا اہتمام بھی باقاعدگی سے کرتے
ہو-میلاد کے جلوس میں جاتے ہو-ہولی کے تہوار میں
تمہارے گھر پر چراغاں ہوتا ہے-اور بے ساکھی

منانے پنجاب چلے جاتے ہو-بیٹے کا نام غیر سید جیسا
فتح محمد رکھتے ہم اور توتے کا نام مستجاب حیدر
رکھکر پھر حیران کردیتے ہو-
میں بابا کو یہ باتیں کرتے سن رہا تھا اور مجھے اپنے
دادا اور دادی کی یاد آرہی تھی-میں تھوڑا سا خود کو
کوس بھی رہا تھاکہ سب لیبیک اللھم لبیک کا ورد
کررہے ہیں اور میں کن سوچوں میں گم ہوگیا ہوں-میں
پریشان تو اس سفر کے آغاز ہی میں تھا-بحری جہاز
میں سوار ہونے سے پہلے ساڑھی میں ملبوس ایک
جھریوں بھرے چہرے والی خاتون نے میرا آجانک ہاتھ
پکڑ لیا تھا اور مجھے کہنے لگی-بالکا! تم اپنے محمد
کی سمادھی پر جاکر میرا پیغام ضرور دینا اور وہ یہ
ہے کہ!ان کے امتی تو ہم ہندؤ عورتوں کو کوڑا
پھینکنے والی مشرک عورت سمجھ کر وہ سلوک بھی
کرنے کو تیار نہیں ہیں جو تم نے اس کے ساتھ کیا تھا-
میں اس بوڑھی ہندؤ عورت کی بات سنکر کانپ گیا تھا
اور مجھے لگا کہ یہ سفر مجھ سے نہیں ہوگا-اب
مجھے اپنے دادا اور دادی کا سفر حج سے واپسی پر
مسلسل اداس رہنا اور بات بے بات گم ہوجانا بری طرح
ستارہا تھا-میں اور بابا جانی کیسے جدہ سے مکہ
پہنچے مجھے معلوم نہیں-سارا راستہ سوچوں میں کٹ

گیا--کبھی اسلام کے ظہور کے وقت کا نقشہ آنکھوں
مین گھومنے لگتا تھا-اور اس دوران تلخیاں ہی تلخیاں
گھلتی چلی جاتی تھیں-میں اور بابا مکّہ میں ایک ایسے
گھر میں ٹھہرے تھے جو ابا کے کسی عربی نژاد
دوست کا تھا-یہ ہاشم علی تھے-جوکہ بنو ہاشم میں سے
تھے اور ابن ابی طالب کی اولاد تھے-بابا نے بتایا کہ
--محلہ بنو ہاشم میں یہ واحد گھر ہے جو اب باقی ہے
ہاشم علی ڈھلتی عمر کے آدمی تھے -آدھی رات کا
وقت ہوگا جب ہاشم نے مجھے جگایا تو میں نے دیکھا
کہ بابا اور ہاشم دونوں کہیں جانے کے لیے تیار تھے-
میں نے بھی فریش ہونے میں دیر نہ لگائی-اور باہر
آگیا-ہاشم کی رہنمائی میں ہم نے بنو ہشم کے محلے
میں اپنا سفر کرنا شروع کردیا-ہاشم ایک چگہ آکر ٹھہر
کیا-یہ بیپ الخلاء بنے ہوئے تھے-میں سمجھا کہ ہاشم
کو حاجت محسوس ہورہی ہے-لیکن ہاشم یک دم کہنے
لگا کہ جانتے ہو یہ کون سی چگہ ہے؟میں نے یہ سوال
کرتے ہوئے ہاشم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے-اور
دیکھا میرے بابا بھی روہانسے سے ہوئے جاتے تھے-
میں نے کہا یا سیدی!میں نہیں جانتا-تو جواب میں کہنے
لگے بیٹا! یہ مومینین کی سب سے پہلی ماں،تماری ماں
فاطمہ کی ماں اور محبوب محمد خدیجۃ الکبری کا گھر

تھا جس کو توحید والوں نے لیٹرینوں میں بدل ڈالا ہے-
میں یہ سب سنکر زرا سکتہ میں آگیا-اور پھر کہنے
لگے کہ بنو ہاشم کے محلے کی تمام نشانیاں مٹا دی
گئں-ابی طالب کا گھر،جعفر طیار کا گھر اور عمار
یاسر کا گھر،حمزہ کا گھر کسی کا کوئی نشان باقی
نہیں رہا-محمد علیہ السلام جہاں پیدا ہوئے وہاں ایک
کتاب گھر بنا دیا گیا-کہیں مال پلازہ بنا دیا گیا-ہاشم مکّہ
کے اندر تاریخ کے قتل کو بیان کرتا ہوا ایک دم مکّہ
کے قبرستان میں پہنچ گیا تھا اور مجھے خاص طور
پر کہنے لگا ایک قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے-(یہ
قبر کیا تھی کنکریوں کا ایک ڈھیر تھا-ایک اعرابی
ابھی کچھ دیر پہلے اس ڈھیر پر اپنے جوتوں سمیت
چڑھ کر گذرا تھا-ہاشم کے دل سے ایک درد بھری
سسکاری نکلی اور میں سمجھا کہ اعرابی نے قبر پر
پیر نہ رکھا ہو بلکہ اس کے دل پر رکھ دیا ہو-ہاشم
کہنے لگا کہ "وائے سیدی حمزۃ ،وائے سیدی
حمزۃ،کیا ہے تیرا نصیب کل ایک ہندہ تھی جو تیرا
کلیجہ چباتی جاتی تھی اور آج ایک سعود کا بیٹا تیری
قبر کو اپنے پیروں سے روندتا ہے-تجھے ایک انقلاب
صداقت کا ساتھ دینے کی اتنی بڑی سزا ملی ہے-
مجھے ہاشم علی عدبی زبان کا جید مرثیہ خواں نظر

آرہا تھا-اور میں سمجھ گیا تھا کہ کس کی قبر ہے اور
کیوں اس قدر بے چین ہے ہاشم-اس نصف رات کو
ہاشم نے مجھے سمیّہ کی قبرکی نشاندہی کی اور پھر
چند اور قبریں دکھائیں-جن پر کوئی نشانی نہیں تھی-
ہاشم کہنے لگا کہ ان قبروں کی علامتیں بنو ہاشم کے
لوگوں کی گٹھی میں پڑی ہیں-سینہ بسینہ یہ علامتیں
محفوظ چلی آتی ہیں اور ہم دور دراز سے آنے والوں
کو تاریخ کو سعود کے بیٹوں کی عینک ہٹاکر دیکھنے
-کی ترغیب دیتے ہیں

میں بابا ،ہاشم جب کعبہ کا طواف کررہے تھے جبکہ
ابھی رش کم تھا تو حطیم کی جگہ پر میں زرا دیر کو
ٹھیر گیا تھا-اور چشم تصور سے وہ منظر دیکھنے لگا
جب ابو جہل نے محمد کے سر پر اوجھڑی رکھ دی
تھی اور کوئی نہیں آیا تھا یہ بچی فاطمہ کی نرم و
نازک چھوٹی چھوٹی انگلیاں تھیں جو روتے روتے ان
سے گند کو صاف کرتی جاتی تھیں-آج اس حطیم
کے ّپاس انے والوں میں سے کتنوں کو یہ واقعہ یاد
ہوگا-مجھے محمد کے آحری خطبے کی یاد بھی آغی
-ةھی

امام کعبہ نے جب ظبہ حج شرو،ع کیا تو مجھے بڑی
حیرت ہوئی کہ اس نے اپنی تقریر میں بھولے سعود

کی غلط کاریوں کا ذکر نہین کیا-بلکہ ان کو خادم
الحرمین شریفین کہہ کر پکارا-اس نے ان کی سسامراج
نوازی اور پوری مسلم دنیا میں فرقہ واریت پر مبنی
خون ریزی کے بیج بونے کی مذمت نہ کی-میں یہ
سب برداشت نہ کرپایا-میں حجر ابن عدی تو نہیں بنا
مگر میں نے خاموشی سے اّنی چگہ چھوڑی اور آہستہ
آہستہ حرم سے نکل آیا-میں نے پہلے بھی غاصب کے
پیچھے نماز ادا نہیں کی-اب چمعہ بھی چھوڑا اور ظہر
-ادا کی

یہ ایک اور منظر ہے-ہماری گاڑی مدینہ کی طرف
جارہی ہے-رستے میں ابواء کا مقام آیا-یہاں محمد کی
والدہ آمنہ کی قبر تھی-اب اس کا نشان تلاش کرنا
کارے دارد تھا-ہاشم یہاں بھی کام آیا-ایک چگہ کی
نشان دہی کی-یہ وہ مقام ہے جہاں محمد قبر کے پاس
واپس مکّہ جاتے ہوئے ٹھہرے تھے اور بلک بلک کر
رونے لگے تھے-کچھ آنسو ہم نے بھی بہائے-اور
مدینہ چل ّپڑے تھے-مدینہ بھی نقشہ بدلا ہوا تھا-روضۃ
الرسول کی سونے کی جالیوں پر کندہ قصیدہ بردہ
شریف کے اشعار پگھلے ہوئے تھے-لگتا تھا کسی نے
ان کو مٹانے کی کوشش کی تھی-میں مدینۃ الرسول میں
ہاشم کی رہنمائی میں حسن کے گھر پہنچا-یہ وہی جگہ

ہے جہاں امام حسن کے تابوت پر مروان نے تیر
برسائے تھے-اور ایک نواسہ اپنے نانے کے پہلو میں
مرنے کے بعد بھی آرام نہ کرپایا-جنت البقیع پہنچا تو
سامنے ایک ڈھیر کنکریوں کا اور اسی جیسے اور
کنکریوں کے ڈھیر ساتھ ساتھ تھے-ہاشم نے زبان سے
کچھ نہ کہا-بس اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں تھیں-اس کی
آنکھوں میں اس قدر احتجاج تھا اور اس قدر اندرہ کہ
مجھے لگا کہ میری ضبط کی ہمت جواب دینے لگی
ہے-ایک چھوٹی سی اونچی جگہ پر مین بے دم سا
ہوکر بیٹھ گیا-ہاشم کی بیٹی اور بیوی دونوں بھی
ہمارے ساتھ تھیں-ہاشم کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی تھی-
فاطمہ تھا اس کا نام -بہت شریں عربی بولتی تھی-وہ
معصومانہ انداز میں ہاشم سے کہنے لگی-بابا یہ
ڈھیریاں کیا ہیں؟اور اس ویرانے میں آپ کیا کرنے آئے
ہیں؟ہاشم اس قدر غم سے نڈھال تھا کہ اس سے کوئی
جواب بن نہیں نہا تھا-تو ہاشم کی بیوی زینب کہنے
لگی کہ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ڈھیریاں نہیں ہیں-
جہاں تم کھڑی ہو وہاں تمہاری ماں کی جد مان آرام
کرتی ہیں-جن کے نام پر تمہارا نام ہے-اور ساتھ
تمہارے بابا حسن آرام کیوں کررہے ہیں-فاطمہ معصوم
تھی کہنے لگے بابا یہاں تو بہت دھوپ ہے اور بہت

گرمی ہے -کوئی سایہ بھی نہیں ہے ان سب کو گھر
-لے چلیں نا
میں روضۃ الرسول پر کھڑا ہوا تو مجھے اس بوڑھی
ہندؤ عورت کی التجاء یاد آئی-لیکن مجھے کچھ کہنے
کی ہمت نہ ہوئی-کیونکہ رسول کی اپنی اولاد جنت
البقیع میں انصاف کی منتظر تھی-اور نہ جانے انصاف
کی منزل کب آنی تھی-میں مدینہ کے نواح میں گیا تو
وہاں ایک کھجور کے درخت سے ٹیک لگائے ایک
عمر رسیدہ عورت کیپر نظر پڑی اس عورت کی
آنکھوں مین نجانے کیا تھا کہ میں کانپ اٹھا-مجھے لگا
کہ یہ عورت بھی انصاف کی متلاشی ہے اور اس
تلاش میں اس کی عمر بھی تمام ہونے کو ہے-واپسی
کے سفر پر میں نے جنت البقیع سے شرطوں کی
نطروں سے بچ کچھ کنکریاں فاطمہ اور حسن کی
-قبروں سے اٹھا لیں تھیں
میں اور باآ حج کرکے واپس آگئے اور گھر آئے تو
مبارک باد دینے والوں کا ایک جم غفیر آکٹھا تھا_مرزا
صاحب اور ان کی بیوی تو کب کے "پرلوک سدھار
چکے تھے مگر اس کا بڑا بیٹا اور اس کی بیوی ہمیں
ےمبارک باد دینے آئے تھے-ہماری آنکھوں میں اداسی
اور اضطراب دیکھ کردونوں میاں بیوی کے ہونٹ

تعجب سے سکڑ گغے کہنے لگے-مستجاب تمہارے
دادا دادی حج سے آئے تھے تو ایسے ہی مضطرب
تھے اور اداس تھے-ہم نے اس کے بعد ان کو ہنستے
ہوئے نہیں دیکھا-اب تم بیٹا اور ےآ آئے ہو تو وہی حال
ہے-بابا اور میں نے ان کي بات سنی اور پھیکی سی
مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا نہیں ایسی بات نہیں
ہے
میری بیوی نے رات ہونے پر مجھ سے پوچھا کہ اتنے
مبارک سفر سے کیا لیکر آئے ہو-میں نے کہا نیک
بخت وہاں سے جو لیکر آیا ہوں آج تک کوئی لیکر
نہیں آیا ہوگا-اور میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے
دو تھیلیاں نکالیں-اور بیگم کو دیں-اس نے کھولیں-اور
کنکریاں دیکھر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں
ہوگئے-میں تھوڑا سا حیران اور پریشان ہوا--مجھے
لگا کہ وہ شائد اس کو مذاق خیال کربیٹھی ہے-میں
ابھی وضاحت کرنے کو تھا تو کہنے لگی کہ آپ کو
پتہ ہے نانا نقی اور نانا زہرہ جب حج کرنے گئے تھے
تو ایسی تھیلیاں لائے تھے اور میرے ہاتھ پر رکھ کر
کہنے لگے تھے ضائمہ بٹیا !لو ہمیں تو اس سے بڑا
تحفہ تمہارے لیا لگا نہین--ایک تھیلی میں تمہاری اماں
فاطمہ کی قبر نما ڈھیری کی کنکریاں ہیں-دوسری میں

تمہارے بیمار عابد کی قبر کی کنکر ہیں-جب کبھی تمہیں اپنے غم بڑے لگنے لگیں اور دکھوں کی پوٹلی بھاری لگے-ان کنکروں کو نکال کر اپنے کی وطن میں غریب الوطن ہونے والی فاطمہ اور خاک و خون میں نہائے ہوئے لاشے کربلا میں چھوڑ کر آنے والے عابد کی قبر میں بے چینی کا تصور کرلینا شائد تمہیں تسلی ہوجائے-

عذاب

کہانی کار:عامر حسینی

نوٹ:میں نے کبھی کہانی پلان کرکے نہیں لکھی ہے-کوئی واقعہ میرے تخیل کو مہمیز دیتا ہے اور کہانی مختلف ریشوں سے بنتی چلی جاتی ہے-یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے-جس کا سبب اس کے پڑھنے والوں سے چھپا نہیں رہے گا-

(ع-ح)

ڈپلومیٹک انکلیو اسلام آباد کی طرف جانے والی شٹل سروسز کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں-جہاں سے شٹل چلتی تھیں وہاں پر مرد اور عورتوں کا ایک جم غفیر دیکھنے کو مل رہا تھا-ملک کے دیگر حصوں سے

آنے والی بسیں اور گاڑیوں سے اترنے والے مسافروں
کی منزل بھی یہی انکلیو تھا-سب یورپی یونین اور
امریکہ کے سفارت خانوں تک جانے کی کوشش
کررہے تھے-سب کے ہاتھ میں فائیلیں تھیں-اور سب
کی کوشش تھی کہ کسی طرح سے وہ اپنی فائیلیں
سفارت خانے میں جمع کراڈالیں-سب ڈرے
ہوئے،سہمے ہوئے نظر آتے تھے-بہت سے لوگ تو
ایسے تھے جن کے اثاثے اس قدر زیادہ تھے کہ ان کو
تو مغربی سفارت خانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا-اور
دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پسند کے ملک میں جاکر
ٹھہر گئے تھے-
اب تو جو بچے تھے اور اس انکلیو تک رسائی کے
لیے کوشاں تھے ان میں
شاعر،ادیب،وکیل،ڈاکٹر،استاد،ہنرمند اور چھوٹے موٹے
کاروباری تھے-جن کے پاس بھاری بینک اسٹیٹمنٹ
نہیں تھی-وہ ان سفارتوں خانوں تک جاکر "سیاسی پناہ
گزین "کے لیے درخواست دینے پر مجبور تھے-
کینڈا ،سویڈن ،امریکہ اور برطانیہ کے سفارت خانوں
کے سامنے ایک لمبی قطار سخت گرمی میں کھڑی
تھی-پسینے سے شرابور مرد ،عورتیں جن کے ساتھ
شیر خوار بچے بھی تھے-صبح سے لائن میں لگے

ہوئے تھے-جولائی کی سخت گرمی اور سورج ایسے
-جیسے سوا نیزے پر آگیا ہو
یہ سب نظارہ کرنے والا جو اس ساری داستان کا راوی
بھی ہے کسی کام سے اسلام آباد آیا ہوا تھا-وہ اتنی بڑی
تعداد میں لوگوں کے ڈپلومیٹک انکلیو کا رخ کرنے پر
متجسس ہوکر یہاں تک چلا آیا تھا-وہ امریکی سفارت
خانے کے سامنے بنی قطار تک جاتا ہے اور قریب
ہونے پر اسے نظر آتا ہے کہ سارے چہرے ایسے
مرجھائے ہوئے ہیں جیسے انہوں نے اچانک موت کو
بھیانک ترین شکل میں دیکھ لیا ہو-سب اس قدر
گبھرائے ہوئے لگتے ہیں اور اس قدر وحشت زدہ کہ
ہمارے راوی کو ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی
نہیں پڑتی-ہمارا راوی ایک صحافی رہا ہے وہ اپنی
صحافت کے زمانے کی تربیت کو کام میں لاکر
امریکی سفارت خانے کے پریس اتاشی تک رسائی
حاصل کرتا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لمبی
قطار والے اصل میں پاکستان کی اس کمیونٹی سے
تعلق رکھتے ہیں جن کو ان کے ملک میں بھیڑ بکریوں
کی طرح کاٹا جارہا ہے-اور ان کے لیے ملک کی
سرزمین تنگ کردی گئی ہے-یہ سب اللہ کی وسیع
زمین میں ہجرت کرنے کے خواہاں ہیں-ان کی نظریں

مغرب کی طرف لگی ہیں-جہاں سے ان کو جینے کی
-مہلت مل جانے کا یقین ہے
پورے ملک میں آگ اور خون بارش ہورہی تھی-امام
بارگاہیں،مساجد،بازار ،اسکول ،کالج،یونیورسٹی ،بازار
سب نشانہ بن رہے تھے-مرد،عورتیں،بچے کوئی ایسا
ذی شعور نہ تھا جو بم کی زد میں نہ آیا ہو-گولیوں
-سے اس کا سواگت نہ ہوا ہو
ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک بازار میدان
جنگ بنا تھا اور لوگ ایک دوسرے پر پل پڑے تھے-
مارے جانے والوں کے لاشے بچ جانے والے حریفوں
کے قبضے میں آئے تو ان حریفوں نے لاشوں کو چیڑ
پھاڑ ڈالا اور ان کے کلیجے چبائے-اور تاریخ کے
پرانے راکھششوں کے کاسٹیومز پہن کر پرانے المیوں
-کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی
ایک اور شہر میں گلیوں اور محلوں میں موجود مساجد
کے اندر غیض و غضب کا شکار مولویوں نے اپنے
ایک بزرگ سن رسیدہ مفتی کے چہرے پر سیاہی ملی
اور اس کو گدھے پر سوار کراکے سارا شہر گھمایا-
بزرگ مفتی نے بس اتنا کہا تھا کہ ہسپتالوں،اسکولوں
اور خواتین و بچوں پر بارود کا عذاب اتارنے والے
مسلمان تو کیا انسان ہی نہیں درندے ہیں-بس پھر کیا تھا

کہ لوگ اس مفتی پر پل پڑے اور اسقدر رسوائی کے
بعد وہ مفتی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے-
ہمارا راوی کہتا ہے کہ اس نے ایک دیوانگی کی حالت
میں پھرنے والے شخص کو دیکھا جو ایک جلے ہوئے
کھنڈرات بنے شہر میں راکھ کے ایک ڈھیر پر بیٹھے،
دیکھا-عجب وحشت طاری تھی اس پر-لگتا تھا جیسے
ابھی یہ شخص خود بارور بنکر پھٹ پڑے گا-ہمارا
راوی اس شخص کے قریب ہوا تو اس کو کہتے ہوئے
سنا کہ

بیٹا ہادی تم اور تمہارا بھائی تقی اپنے ناموں کی وجہ
سے ہی نہیں مارے گئے بلکہ یہاں تو ابوبکر ،عمر اور
عثمان بھی اپنے ناموں کی وجہ سے مارے گئے-میں
گلی،گلی،قریہ قریہ کبھی عمر و عثمان کے پاس جاتا
اور کبھی علی و حسین کے پاس جاتا تھا-ان سب کو
سمجھاتا کہ یہ جو عرب کے پیٹرو ڈالر لیکر عبداللہ کا
کاسٹیومز پہن کر بدو آتے ہیں ان کے چوغوں میں
صہیونیوں اور انکل سام کے بت چھپے ہوئے ہیں-اور
میں نے بہت کہا کہ دیکھو بغدار کے معتصم باللہ کے
بیٹے کے ہاتھوں ہمارے کرخ کی تباہی کی سازش پھر
سے ہورہی ہے-اور کوئی ابن علقمی پھر انتقام میں
اندھا ہوکر ہماری تہذیب کے مرکز کو پھر سے راکھ

کا ڈھیر بنانے پر تلا ہوا ہے-ہمیں اپنے دجلہ جیسے
دریائے سندھ کو خون سے سرخ ہونے سے اور اپنے
فرات جیسے راوی کو کتابوں کی راکھ سے سیاہ ہونے
سے بچانے کی کوشش کرنا ہوگی-
میرے بیٹے ہادی تم جو اصغر جیسے بھائی کو بچاتے
مارے گئے تو میں نے تمہاری آنکھوں میں جو کرب
دیکھا تھا اس کے بعد مجھے مرجانا چاہئیے تھا-لیکن
میں نے تو بہت سے معصوم اصغروں کے لاشے
ٹکڑوں میں بٹے دیکھے تھے --اس لیے بس ہائے
وائے کرکے رہ گیا-،
میری نہ تو کرخ والوں نے سنی اور نہ ہی محلہ ابی
حنیفہ والوں نے-گامے شاہ جانے والے بھی مری بات
نہ سمجھے اور شاہ حسین کے دربار پر جانے والے
بھی اپنی سماعتوں کو کہیں اور مرکوز کرتے رہے
اور اب میں جلے شہر کی راکھ پر بیٹھا ماتم کرتا ہوں-
راوی کہتا ہے کہ اس کو وہ شخص اپنی گفتگو میں
کہیں بھی دیوانہ نہیں لگا-
یہ عجب شہر تھے کہ یہاں بے سروسامانی کے عالم
میں جو تھے وہ ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہے تھے-
جن پر کچھ تھا وہ مغربی سفارت خانوں کے سامنے
پناہ گزینی کی درخواستیں لیے لائن میں لگے کھڑے

تھے-اور جو مالدار تھے جنہوں نے کہیں پیٹرو ڈالرز
سے لطف اٹھایا تھا تو کہیں بھاری مشاہرے پر مغرب
کی جامعات میں بھاشن گیری کی تھی وہ امریکن ائیر
لائنز سے کب کے اڑن چھو ہوگئے تھے-ہر طرف آگ
لگی ہوئی تھی-گلے کاٹے جارہے تھے-کلیجے چبائے
جارہے تھے-اور مساجد کے مناروں میں آگ لگي ہوئی
تھی-علم عباس گرادیا گیا تھا-کلیسا کے گھنٹے کی
سوئی ٹوٹ چکی تھی گویا وقت تھم گیا تھا-مرکز
احمدیہ میں ایک باریش آدمی کی لاش پر ایک ننھی
لاش پڑی تھی جس کے نازک سے ہاتھ باریش آدمی
کے سر پر ایسے رکھے تھے جیسے انگلیاں پھیرتے
اچانک ساکت ہوگئے ہوں-قریب ایک اسکول کے باہر
عین گیٹ کے سامنے ایک لڑکی کی لاش بنا سر کے
پڑی تھی اور اس کے بدن سے لپٹا اس کا بستہ عجب
کہانی سنارہا تھا-عین سڑک کے بیچ ایک عورت کی
لاش پڑی تھی جس کے پاس ہی ٹفن کھلا پڑا تھا-سالن
رس رس کے باہر نکل رہا تھا اور روٹیاں اور بوٹی
بکھری ہوئی تھی جس کے قریب بلیاں آنے سے
گریزاں تھیں اور دائرہ بناکر عورت کی لاش کے گرد
بیٹھی تھیں-ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے-

جہاں انسان ماتم کرنے اور گریہ کرنے سے گریزاں
ہوں وہاں پھر یہ فریضہ جانور سنبھال لیتے ہیں